قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا چوہترواں سال

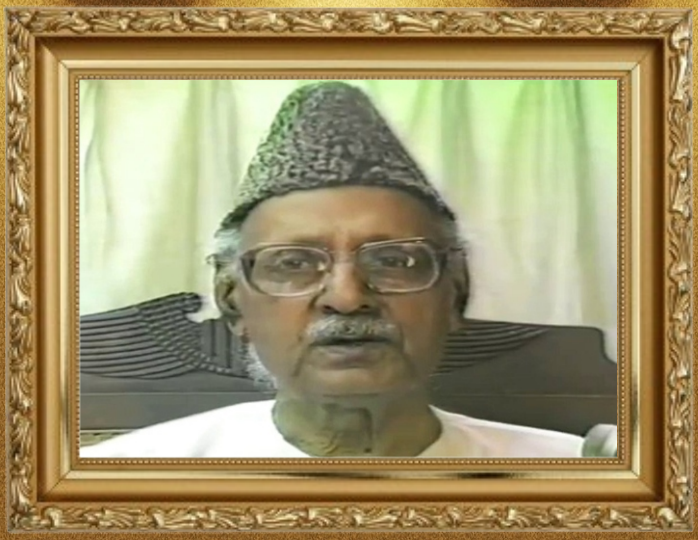
ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

فروری 2017ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ



فکرِ قرآنی کے لئے پرویزؒ سند نہیں

''میں اپنی بصیرت کے مطابق قرآنی فکر پیش کرتا ہوں۔ آپ کے لئے ضروری ہے کہ آپ از خود قرآنِ کریم پر غور و فکر کے بعد فیصلہ کریں کہ میری فکر صحیح ہے یا نہیں۔ اسے اچھی طرح سن رکھئے کہ جس دن آپ نے دین کے معاملہ میں قرآنِ کریم کی بجائے کسی انسان کو سند مان لیا، آپ نے فرقہ بندی کی بنیاد رکھ دی اور یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ فرقہ پرستی قرآن کی رُو سے شرک ہے۔''

(غلام احمد پرویز، طلوعِ اسلام اپریل 1960ء)

رکوع وسجود وعبادت کا مقصد

جب ذہنِ انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا تو وہ (بچے کی طرح) محسوس اشیاء ہی کو سمجھتا تھا اور اپنے خیالات کا اظہار بھی محسوس طور پر کرتا تھا۔ آج کل کی علمی اصطلاح میں یوں کہئے کہ اس کا علم (Sense Perception) یعنی حواس کے دائرہ میں محدود تھا۔ وہ ہنوز تصورات (Concepts) کے ذریعے حصولِ علم یا اظہارِ خیالات کی منزل تک نہیں پہنچا تھا۔ یعنی وہ (Formalism) کی منزل میں تھا۔ اس نے ''خدا'' کے لئے محسوس پیکر تراش رکھے تھے۔ پوجا پاٹ کے طریق اور دیگر مذہبی رسوم و تقاریب میں بھی سارا زور شکل (Form) پر دیا جاتا اور اسے ہی مقصود بالذات سمجھا جاتا تھا۔

قرآن کریم نے اپنی تعلیم میں انسان کو عہد طفولیت سے نکال کر سن شعور اور بلوغت میں لا کر مخاطب کیا ہے۔ وہ علم بالحواس کے ساتھ تصوراتی علم پر بھی زور دیتا ہے اور دین کے معاملہ میں بھی شکل کی بجائے معنویت (مقصود ومفہوم) کی اہمیت کو نمایاں کرتا ہے لیکن وہ شکل کو بالکل ترک نہیں کرتا۔ عبادات میں رکوع وسجود میں انسان سچ مچ اپنا سر خدا کے سامنے جھکاتا ہے۔ جسم کی ان حرکات و سکنات کے پیچھے ایک فلسفہ کارفرما ہے جسے دورِ حاضر کی اصطلاح میں متوازیت (Parallelism) کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے نفس (Mind) کے ارادے اور اس کے جسم کی حرکت میں گہرا تعلق ہوتا ہے اور یہ دونوں متوازی چلتے ہیں۔ اس لئے کہ انسان کو تصورات کی تعبیر کے لئے شکل (Form) کے بغیر نہ چارہ ہوتا ہے' نہ تسکین۔ بڑے سے بڑا تصوراتی مفکر بھی جب بات کرتا ہے تو اس کے ہاتھ' پاؤں' سر' آنکھ کی حرکات ناگزیر ہوتی ہیں۔ وہ ان محسوس اشارات کے بغیر اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کر ہی نہیں سکتا۔ (وہ اس طرح مجرد حقائق (Abstract Truths) کو بھی محسوس مثالوں سے سمجھاتا ہے) یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم نے (Form) سے اس قدر بلند ہو جانے کے باوجود' بعض مقامات میں اسے باقی رکھا ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان کا اس طرح خدا کے سامنے سر جھکا دینا' اس کے اس جذبہ اور ارادہ کا محسوس مظاہرہ ہوگا کہ وہ قوانین خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہے۔ یعنی وہ خدا کی کامل اطاعت کا عہد کرتا ہے۔ یہ ''محکومی'' درحقیقت' زندگی کی بلند' مستقل اقدار کو ازخود اپنے اوپر عائد کرنا ہوتا ہے۔ کسی کی خارج سے عائد کردہ پابندیاں نہیں ہوتیں۔ نہ ہی اس میں (Worship) کا وہ مفہوم ہوتا ہے جسے زمانہ قدیم کے انسان نے' فطرت کی قوتوں سے ڈر کر' انہیں خوش کرنے کے لئے' اپنے ذہن سے وضع کیا تھا۔ اگر انسان کا

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

جلد 70 | شمارہ نمبر 02

فروری 2017ء

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: غلام احمد پرویزؒ اور تحریک طلوع اسلام	ادارہ	4
پرویز صاحب کا نظریۂ اسلامی مملکت	منظور حسین لِیل	19
اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کا مفہوم کیا ہے	غلام احمد پرویزؒ	26
شہری و انسانی حقوق	خواجہ ازہر عباس	46
باب المراسلات	ڈاکٹر انعام الحق	54

ENGLISH SECTION

Manzil ba Manzil (منزل بہ منزل) **Chapter 3: Spring's Message**

(*Payam-e Fasl-e Bahar* (پیام فصل بہار) – **Message to Fellow-Ambassadors**

(Tulu-e-Islam Convention, November, 1959) **(Episode-2)**

By G. A. Parwez (Translated by: M. Alam) **60**

زرِ تعاون

پاکستان: 550/- روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 800/- روپے سالانہ

بیرون ملک: 2500/- روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 5000/- روپے سالانہ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

Idara Tolu-e-Islam Bank Account National Bank of Pakistan

Main Market Branch Gulberg Lahore

For Domestic Transactions

Bank A/C No: 0465-22-003082-7

For International Transactions

IBAN: Pk21 NBPA 0465 0022 0003 0827

Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ نمبر 2، لاہور۔54660، (پاکستان) فون: 042-35714546 ، 0321-4460787

idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو، زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں، وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے، معمارِ جہاں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
جہانِ آب و گل سے عالم جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے
یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

غلام احمد پرویزؒ اور تحریک طلوعِ اسلام

(مختصر تعارف)

علامہ اقبالؒ نے دمِ واپسیں فرمایا تھا:

سرُودِ رفتہ باز آید کہ ناید نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے دگر دانائے راز آید کہ ناید؟

علامہ غلام احمد پرویزؒ (رحمۃ اللہ علیہ) کی ولادت مورخہ 9 جولائی 1903ء کو (موجودہ مشرقی پنجاب کے) ضلع گورداسپور کے قصبہ بٹالہ میں ہوئی۔ آپ کے دادا' مولوی' چوہدری' رحیم بخش حنفی مسلک کے ایک جید عالم اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے ایک ممتاز بزرگ ہونے کے علاوہ ایک ماہر طبیب اور سنسکرت کے عالم تھے۔ علامہ غلام احمد پرویزؒ کی ابتدائی تربیت اپنے دادا کی زیرنگرانی ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ میٹرک تک پہنچتے پہنچتے ان کی نگاہ کی مشرقی مغربی افقین کافی وسیع اور ''باطنی علوم'' کی گہرائیاں کافی عمیق ہو چکی تھیں۔

بی۔اے پاس کرنے کے بعد سول سروس میں چلے گئے اور 1954ء میں جب کہ آپ وزارتِ داخلہ میں اسسٹنٹ سیکریٹری کے عہدہ پر فائز تھے۔ قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی تا کہ اپنے قرآنی مشن کو پورا وقت دے سکیں۔

اس دوران میں آپ کی زندگی علمی معرکہ آرائیوں سے عبارت رہی۔ 1932ء میں ابوالکلام آزاد کے تفسیری ترجمہ' ترجمان القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ انہوں نے سورۃ الفاتحہ کی تفسیر کے سلسلے میں اپنے اس نظریہ کی تبلیغ بڑی صراحت سے کی تھی کہ:

''عالمگیر سچائیاں دنیا کے ہر مذہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ اس لئے تمام مذاہب سچے ہیں لیکن پیروانِ مذہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں۔ اسلام کہتا ہے کہ اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سرِ نو اختیار کر لیں تو میرا کام پورا ہو گیا۔ یہ فراموش کردہ سچائی کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عمل کی زندگی۔ یہ کسی ایک گروہ کی میراث نہیں کہ اس کے سوا کسی انسان کو نہ ملی ہو۔ یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے۔''

علامہ پرویزؒ کی بصیرتِ قرآنی کے مطابق یہ نظریہ' اسلام کو اس کی جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ یہ برہموسماج کی تعلیم تو ہو سکتی ہے قرآن کی نہیں۔ اس لئے آپ نے اس کی تردید میں ایک تفصیلی مقالہ لکھا جو ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ) (سید

سلیمان ندوی کی زیرِ ادارت) کی جنوری 1933ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔

اس زمانے میں ابوالکلام آزاد کی شہرت ثابہ ثریا پہنچی ہوئی تھی۔ وہ قلم اور زبان کے بادشاہ اور علم کے سمندر سمجھے جاتے تھے۔ علماء کی صف میں وہ امام الہند قرار دیئے جاتے تھے۔ ان کی پیش کردہ تفسیر کی مخالفت اور وہ بھی ایک ''غیر مولوی'' کی طرف سے کسی کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔ لیکن یہ علامہ پرویزؒ کی جرأتِ ایمانی تھی کہ آپ نے سب سے پہلے اس تفسیر پر اپنی تنقید شائع کی۔

1926ء میں ریاست بہاولپور کی ایک عدالت میں ایک مسلمان خاتون نے دعویٰ دائر کیا کہ اس کا خاوند قادیانی مسلک اختیار کرنے سے مرتد ہو گیا ہے لہٰذا اس شخص سے مدعیہ کا نکاح فسخ قرار دیا جائے۔ یہ مقدمہ قریب نو سال تک زیرِ سماعت رہا اور آخر الامر محمد اکبر صاحب (مرحوم) ڈسٹرکٹ جج بہاولنگر نے 7 فروری 1935ء کو اس کا فیصلہ سنا دیا۔ یہ فیصلہ علامہ پرویزؒ کے ایک مضمون ''میکانکی اسلام'' میں ضمناً بیان کردہ نبی کی تعریف کی بنیاد پر سنایا گیا تھا۔ جس کا ذکر فاضل جج نے اپنے فیصلہ میں وضاحت کے ساتھ کیا تھا۔ اس طرح قادیانیوں کو پہلی بار کافر قرار دینے کی علمی بنیاد علامہ پرویزؒ کی فراہم کردہ تھی۔ بعد میں آپ نے اس موضوع پر ایک کتاب ''ختم نبوت اور تحریکِ احمدیت'' 1974ء میں شائع کی۔

علامہ اقبالؒ کے خاکہ کے مطابق جناب پرویزؒ نے سلسلہ ''معارف القرآن'' کی ابتدا 1928ء میں کی۔ پہلی جلد کا عنوان تھا۔ ''اللہ'' جو بعد میں ''من و یزداں'' کے نام سے شائع ہوئی۔ پھر ''ابلیس و آدم'' تحریر کی۔ جس میں آدم۔ ابلیس۔ ملائکہ۔ جن۔ شیطان۔ وحی۔ رسالت وغیرہ عنوانات پر قرآنی تصریحات پیش کی گئیں۔ معارف القرآن کی تیسری جلد ''جوئے نور''۔ چوتھی جلد ''برقِ طور'' اور پانچویں جلد ''شعلۂ مستور'' حضرت نوحؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک انبیاء کرامؑ کے حالات زندگی کو محیط ہیں۔ پھر نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ بعنوان ''معراجِ انسانیت'' شائع کی۔ وحی کی ضرورت اور اہمیت اجاگر کرنے کے لئے ڈھائی ہزار سال کی فکری کاوشوں کا نچوڑ۔ ''انسان نے کیا سوچا''۔ کے عنوان سے ایک کتاب میں پیش کیا۔ جس کو پڑھنے سے یہ حقیقت ابھر اور نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ عقلِ انسانی۔ انسانی مسائل کو حل کرنے میں کس طرح ناکام رہی ہے اور پھر یہ بتانے کے لئے کہ وحی کی رو سے انسانی مسائل کا حل کیا ہے۔ آپؒ نے ایک کتاب بعنوان۔ ''اسلام کیا ہے؟'' شائع کی۔ معاشی مسئلہ ہمارے دور کا اہم ترین مسئلہ شمار ہوتا ہے۔ اس دور میں معاشی نظریات کی بنیاد پر دنیا دو بڑے بلاکوں میں منقسم تھی۔ اس مسئلہ کے قرآنی حل کو پیش کرنے کے لئے آپ نے متعدد تقاریر کیں اور مضامین شائع کئے جن میں سے کچھ ''خدا اور سرمایہ دار'' نامی کتاب کی شکل میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ ایک مبسوط تصنیف ''نظام ربوبیت'' شائع کی۔

تقدیر کا مسئلہ صدیوں سے الجھا چلا آ رہا ہے۔ اس مسئلہ کو قرآن کی روشنی میں حل کرنے کے لئے آپؒ نے ''کتاب التقدیر'' تحریر کی۔ آخرت کے متعلق قرآنی توضیحات کو ایک کتاب بعنوان ''جہانِ فردا!'' میں شائع کیا اور اس طرح قریب چالیس سال کی محنتِ شاقہ سے سلسلہ معارف القرآن کو تکمیل تک پہنچایا۔

علامہ احمد امین مصری (مرحوم) نے اپنی کتاب فجر الاسلامؔ میں بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ دیگر قوموں کے تصورات کس طرح رفتہ رفتہ مسلمانوں پر اثر انداز ہوتے گئے اور یوں قرآن کے تصورات کی جگہ غیر قوموں کے تصورات نے لے لی۔ چنانچہ آج جسے مذہبِ اسلام کہا جاتا ہے۔ یہ مجموعہ ہے مختلف قوموں سے مستعار تصورات کا جن پر لیبل قرآنی اصطلاحات کا لگا دیا گیا ہے۔ ان تصورات سے اور تو اور عربی زبان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی تھی کہ قرآنِ حکیم کے الفاظ کا کوئی ایسا لغت مرتب کیا جائے جس میں نہ صرف الفاظ کے وہ معنی دیئے جائیں جو زمانہ نزولِ قرآن میں رائج تھے بلکہ ان الفاظ کے پس منظر میں قرآنی تصورات کی بھی وضاحت کی جائے۔۔۔۔ یہ کام ایک آدمی کے کرنے کا نہ تھا' لیکن اگر انسانوں کی ایسی جمعیّت موجود نہ ہو تو؟ جناب پرویز ہمت ہارنے والے نہ تھے چنانچہ آپ نے چار جلدوں میں ایک ایسا لغت تیار کر دیا جس کی تیاری میں اپنی قرآنی بصیرت کے علاوہ قریب پچاس عربی لغت حوالے کے لئے استعمال کئے۔

اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ جناب پرویزؒ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے:

''اس لغت کے شائع ہونے کے بعد ایک دن ایک عراقی عالم مجھ سے ملنے کے لئے آئے۔ حکومتِ پاکستان کے رابطۂ عوامی کے ایک آفیسر بھی ان کے ہمراہ تھے۔ اس نے کہا کہ عراقی علماء کی ایک تنظیم قرآنِ مجید کا لغت مرتب کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس کے لئے انہوں نے چاہا ہے کہ جہاں جہاں قرآن کا لغت مدون کرنے کا کام ہوا' یا ہو رہا ہو' ان حضرات سے مل کر اس سلسلہ میں ضروری معلومات حاصل کی جائیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس سلسلہ میں مجھ سے ملنے آئے ہیں اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ تنظیم کون سی ہے جس کے زیر انتظام تمہارے لغت کی تدوین کا کام شروع کیا گیا۔ وہ جماعت کن علماء پر مشتمل تھی' جس نے اس لغت کو مرتب کیا۔ اس کی تکمیل میں کتنا عرصہ لگا۔ اس پر کس قدر خرچ اٹھا۔ اس کی اشاعت کا انتظام کس نے کیا؟ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ان سے کہا کہ اس کے لئے نہ کوئی تنظیم تھی' نہ جماعت' نہ کوئی مالی ذریعے تھے نہ مادی اسباب۔ یہ سب کچھ میں نے تنہا کیا ہے اور اس کے ساتھ یہ تمام کتابیں بھی تصنیف اور شائع کی ہیں جو آپ کو ان الماریوں میں نظر آ رہی ہیں۔ وہ صاحب خندۂ زیر لبی سے یہ سب کچھ سنتے رہے۔ میں کسی کام کے لئے گھر کے اندر گیا۔ باہر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ایکا ایکی اٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت طنزیہ انداز سے علیک سلیک کرتے ہوئے واپس جا رہے ہیں۔ ان کا یہ انداز اور اقدام ایسا ناقابل فہم تھا کہ ان سے اس کی وجہ دریافت کرنے کو جی ہی نہ چاہا۔ کچھ دنوں بعد' رابطۂ عوامی کے اس افسر سے جو ان کے ساتھ آئے تھے سرِ راہ میری ملاقات ہوئی' تو میں نے ان سے پوچھا کہ اس دن کیا بات ہوئی تھی؟ انہوں نے کہا کہ آپ اندر گئے ہیں تو ان صاحب نے کہا یہ شخص بالکل غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص تنہا اتنا کام کر لے' سو جب یہ اصلی بات بتانا نہیں چاہتا تو اس سے کچھ پوچھنا بیکار ہے۔ میں یہ سن کر مسکرایا اور ان سے کہا کہ خیر گذری میں نے انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ اس دوران میں میں نے تیس سال سرکاری ملازمت بھی کی ہے (اس نے اسے بتا دیا تھا)۔''

(طلوع اسلام، دسمبر 1978ء صفحہ:49)

سلسلۂ معارف القرآن اور لغات القرآن کے علاوہ جناب پرویزؒ نے ''مفہوم القرآن'' تین جلدوں میں مرتب کیا۔ قریب ڈھائی ہزار عنوانات کے تحت قرآنی مضامین کو مرتب کر کے ''تبویب القرآن'' شائع کی اور ''مطالب الفرقان'' کے نام سے تفسیر مرتب کر رہے تھے جس کی سات جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

سلیم کے نام خطوط (تین جلدوں میں) اور ''طاہرہ کے نام خطوط'' قرآنی تعلیمات پر مشتمل ادب پارے ہیں۔ کم تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے اسلامی معاشرت اور پھر قرآن کے بیان کردہ قوانین۔ بعنوان ''قرآنی قوانین'' اور انگریزی زبان میں کتاب۔۔۔۔ (Islam a Challenge to Religion) اس پر مستزاد ہیں۔ غرض کس کس کاوش کا ذکر کیا جائے۔

ان علمی کارناموں کو سرانجام دینے کے علاوہ آپ نے تحریکِ پاکستان میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ قائداعظمؒ کے ارشاد کے مطابق دہلی سے ماہنامہ طلوع اسلام جاری کیا جو اپنے پہلے دور میں اپریل 1938ء سے مئی 1942ء تک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا اور اس کے ذریعے آپ نے تحریک پاکستان کے مخالف نیشنلسٹ علماء کے مقابلے میں قلمی جہاد کیا۔ اس دور میں یہ واحد جریدہ تھا جس نے تحریک پاکستان کے دینی پہلو کو اجاگر کیا اور بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ تحریک پاکستان کی صحیح اور مکمل تاریخ طلوع اسلام کے اس دور کے فائل کے بغیر مرتب نہیں کی جا سکتی۔

قائداعظمؒ پروٹوکول کے بڑی سختی سے پابند تھے۔ انہیں کوئی شخص پیشگی وقت لئے بغیر نہیں مل سکتا تھا لیکن یہ شرف جناب پرویزؒ کو حاصل تھا کہ آپؒ کسی بھی وقت قائداعظمؒ سے ملاقات کر سکتے تھے۔ باوجود اتنے قریب ہونے کے جناب پرویزؒ نے کبھی اس بات کو فخریہ بیان نہیں کیا اور نہ ہی پاکستان بن جانے پر کوئی مراعات حاصل کیں۔

پاکستان بن جانے کے بعد جنوری 1948ء میں آپؒ نے دوبارہ طلوع اسلام شائع کرنا شروع کیا۔ جو باقاعدگی سے تاحال جاری ہے۔ پاکستان بن جانے کے بعد پاکستان کے دشمن عناصر بھی یہاں ہجوم کر کے آ گئے اور یہاں آ کر پر پرزے نکالنے لگے۔ اب ان کے پیش نظر مقصد یہ تھا کہ ان کی مخالفت کے علی الرغم اگر پاکستان بن ہی گیا ہے تو اس میں وہ نظام نہ رائج ہونے دیا جائے جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا۔ وہ اسلام کی آڑ میں یہاں تھیاکریسی رائج کرنے کی کوششیں کرنے لگے۔ اب دوبارہ جناب پرویزؒ کو ان کے خلاف قلمی جہاد کرنا پڑا۔ قراردادِ مقاصد اور علماء کے بائیس نکات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں جن پر جناب پرویزؒ نے تفصیلی تنقید کی۔ آپؒ نے تفصیلاً بتایا کہ جسے علماء 'سنت' کہتے ہیں وہ نہ تو متفق علیہ ہے کہ اس کی رو سے کوئی متفق علیہ قانون مرتب کیا جا سکے۔ علماء کا سنت پر اس قدر زور دینا محض اس لئے ہے کہ یہاں قرآنی نظام رائج نہ کیا جا سکے۔ مخالفین سے آپؒ کے پرزور دلائل کا جواب تو بن نہ پڑا۔ انہوں نے آپؒ کے خلاف فتویٰ کفر دے دیا جس پر ایک ہزار ''علماء'' کے دستخط ثبت تھے۔

ضخیم تصانیف کی لمبی فہرست۔ ماہنامہ طلوع اسلام کے ہزارہا صفحات۔ ہفتہ وار درس اور تقاریر کے ٹیپس (Tapes) کا ڈھیر جو اب سی ڈی/ ڈی وی ڈی میموری کارڈز کی شکل میں دستیاب ہیں نیز تسوید کے بعد طباعت بھی ہو رہی ہے۔ تحریکِ

پاکستان میں' باوجود سرکاری ملازم ہونے کے سرگرم شمولیت' قائداعظمؒ سے قرب حاصل ہونے کے باوجود مراعات حاصل کرنے سے انکار' اپنے خلاف فتوؤں سے بے پروا ہو کر اپنے مشن میں مگن۔ اپنی ہزار سالہ تاریخ کھنگال ڈالئے۔ ہے کوئی ایک بھی ایسا شخص جس نے تنِ تنہا اتنا زیادہ اور اتنا ٹھوس کام کیا ہو؟

5 اکتوبر 1984ء کو آپ نے آخری بار درسِ قرآن دیا اور اس کے بعد مسلسل بستر علالت پر رہے۔ اور 24 فروری 1985ء کو شام چھ بجے آپؒ اس دارِ فانی سے انتقال فرما گئے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۝ (55:26-27)

کیونکہ ؎

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

تحریکِ طلوعِ اسلام کا تعارف

(بانیٔ تحریک کے الفاظ میں)

تقسیم سے قبل گو طلوعِ اسلام کا مقصد تحریکِ پاکستان کی تائید تھا لیکن اس کی یہ تائید دورِ حاضرہ کی اصطلاح یا مفہوم میں ایک ''سیاسی مقصد'' کے حصول کے لئے نہیں تھی۔ طلوعِ اسلام کا مؤقف قرآنی تصور کی ہمنوائی میں یہ تھا کہ اسلام' ایک دین (یعنی نظامِ مملکت) کی شکل میں اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے جب مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں قرآنی اقدار کی حکمرانی ہو۔ اس طرح یہ حصولِ پاکستان کی سیاسی جنگ کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو ذہنوں میں جاگزیں کرتا چلا گیا کہ اسلام کا مقصود کیا ہے اور دین کا مطمحِ نگاہ کیا' وہ کس قسم کا ضابطۂ زندگی اور نظامِ حیات پیش کرتا ہے اور وہ ضابطہ یا نظام کس طرح دیگر نظامہائے حیات سے منفرد اور بے مثال ہے۔ وہ کیوں کسی اور ضابطہ سے مفاہمت نہیں کر سکتا اور اس میں کیوں کسی اور نظام کا پیوند نہیں لگایا جا سکتا۔

نظامِ خداوندی کو ایک آزاد خطۂ زمین پر مشہود کرنے کی یہی وہ حسین آرزو اور مقدس تمنا تھی جس کو لے کر حصولِ پاکستان کے بعد طلوعِ اسلام پھر جادہ پیما ہوا۔ اس کے نزدیک حصولِ مملکت کے بعد سب سے پہلا کام یہ تھا کہ دین کے جن امور کو وہ اب تک اصولی طور پر پیش کرتا چلا آیا ہے ان کے تمام پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈال کر اس کے نمایاں خط و خال امت کو دکھائے

اورقرآن ہی کی روشنی میں اس کے قیام کی موجودہ عملی صورت کا تعین کرے۔طلوع اسلام کے پیشِ نظر دوسرا کام یہ تھا کہ وہ تمام سلیم قلب، سعید روحیں اور جو قرآنِ کریم کے اس حیات آفریں پیغام سے ہم نوا ہیں لیکن کسی مرکز کے نہ ہونے کے سبب تسبیح کے بکھرے ہوئے دانوں کی طرح ایک دوسرے سے بے خبر اطراف و جوانبِ ملک میں الگ الگ پڑی ہیں اور باوجود ہزار بار سوچنے کے آگے قدم نہیں اٹھا سکتیں کہ وہ اس میدان میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتی ہیں انہیں یک دلی اور ہم مشربی کے رشتۂ محکم میں منسلک کر کے ایک ذہنی مرکز پر جمع کر لیا جائے اور اس طرح ان افراد کے اجتماع سے وہ قافلہ مرتب ہو جائے جس کا ہر قدم صحیح منزل کی طرف اٹھے۔

جہاں تک قرآنی نظامِ زندگی کے خط و خال کا تعلق ہے اس کی تفصیل طویل ہے اور اس مختصر وقت میں اسے پیش کرنا دشوار۔محترم پرویزؔ صاحب نے اس کو وضاحت کے ساتھ رسالہ طلوع اسلام کے ہزار ہا صفحات اور بیسیوں کتابوں کی شکل میں نقش کر کے انہیں ملک میں عام کر دیا ہے اور جن کا چرچا آپ چہار اطرافِ عالم میں سنتے ہیں لیکن مختصر طور پر پرویزؔ صاحب نے جو طلوع اسلام کے مقصد کی وضاحت میں پیش کیا ہے، یہ ہے:

(1) دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں سے خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرائے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کی محکومی اور غلامی میں نہ رہے۔خواہ یہ غلامی ذہنی اور فکری ہو اور خواہ طبعی اور اقتصادی۔

(2) قوانینِ خداوندی کی اطاعت ایک نظام کی رو سے ہو سکتی ہے جسے استخلاف فی الارض (یا نظامِ مملکت) کہتے ہیں۔قرآن کی رو سے استخلاف فی الارض کے بغیر دین کا تمکن ہو ہی نہیں سکتا۔

(3) قرآن نے (بجز مستثنیات) دین کے اصولی قوانین دیئے ہیں اور اسے اس نظام پر چھوڑا ہے کہ وہ ان اصولوں کی روشنی میں اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق جزئیات خود متعین کرے۔

(4) رسول اللہ نے سب سے پہلے نظامِ قرآنی قائم کیا اور اپنے رفقائے کار (صحابہ کبار رضی اللہ تعالیٰ عنھم) کے مشورہ سے قرآن کے اصولی احکام کی جزئیات مرتب فرمائیں۔

(5) رسول اللہ ﷺ کے بعد دین کا یہی نظام حضور ﷺ کے خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنھم نے جاری رکھا جو امورِ ملت کو ملت کے مشورہ سے سرانجام دیتے تھے۔قرآن کے جن اصولوں کی جزئیات اس سے پہلے متعین نہیں ہوئی تھیں انہوں نے ان کا تعین کیا جن میں کسی ردوبدل کی ضرورت تھی ان میں ضروری تغیر و تبدل کیا، جن میں ایسی ضرورت نہیں تھی انہیں علیٰ حالہٖ باقی رکھا۔

(6) بدقسمتی سے خلافت علی منہاجِ نبوت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا قرآنی نظام باقی نہ رہا، اس سے امت میں انتشار پیدا ہو گیا جس میں ہم اس وقت تک مبتلا ہیں۔اب کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے اسی انداز کا نظام قائم کیا جائے جو امت کو قرآن کے مطابق چلائے۔

(7) جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہوتا امت کے مختلف فرقے' جزئیات پر جس جس انداز سے عمل پیرا ہیں کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کسی قسم کا ردوبدل کرے۔ یہ حق صرف قرآنی نظام کو پہنچتا ہے کہ وہ ان اختلافات کو مٹا کر پھر سے امت میں وحدت پیدا کرے۔ اس دوران میں اتنا ہی کیا جا سکتا ہے کہ دین کے اس تصور کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور ہم میں جو عقائد و رسومات ایسی رائج ہو چکی ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں ان کی طرف توجہ دلائی جائے تاکہ جو لوگ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے کا جذبہ اپنے اندر رکھتے ہوں وہ اپنی اصلاح کرتے چلے جائیں۔

(8) قرآن تمام نوعِ انسانی کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس کے ساتھ وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لہٰذا نہ قرآن کے بعد خدا کی طرف سے کوئی اور کتاب آ سکتی ہے' نہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی اور نبی یا رسول۔

(9) قرآن کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے زمانہ تک مختلف علوم و فنون جس حد تک ترقی کر چکے ہیں وہ سب انسان کے سامنے ہوں اور چونکہ قرآن کا ارشاد ہے کہ یہ تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر لاینفک ہے۔

(10) نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مقدسہ' شرفِ انسانیت کی معراج کبریٰ کی مظہر تھی لیکن بدقسمتی سے ہماری کتب روایات و تاریخ میں ایسی باتیں شامل ہو گئی ہیں جن سے حضور ﷺ کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ آپ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآن کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی اور یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن کے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضور ﷺ پر کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو وہ بات ہمارے نزدیک وضعی ہے اور حضور ﷺ کی طرف غلط منسوب۔ ضرورت ہے کہ سیرتِ نبویؐ کے صحنِ چمن سے ان کانٹوں کو الگ کر دیا جائے۔ جو روایات نہ قرآن کے خلاف ہیں اور نہ ہی ان سے حضور ﷺ کی سیرتِ مقدسہ پر کسی قسم کا حرف آتا ہے انہیں ہم صحیح مانتے ہیں۔

(11) ہم دین میں فرقہ سازی کو شرک سمجھتے ہیں اس لئے ہم کوئی فرقہ پیدا نہیں کرنا چاہتے' احکامِ اسلامی کے متعلق البتہ ہم یہ ضرور کہتے ہیں کہ ان کی پابندی محض ایک رسم کے طور پر نہیں کرنی چاہئے بلکہ ان کی روح پر بھی نگاہ رکھنی چاہئے۔

(12) قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ انسان کی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہو جائے تاکہ نوعِ انسانی اس زندگی میں سر اٹھا کر چلنے اور اس کے بعد کی زندگی میں شرفِ انسانیت کے باقی مراحل طے کرنے کے قابل ہو سکے۔

(13) قرآنی نظام میں تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری معاشرہ پر ہوتی ہے اس اہم فریضہ کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ وسائل پیداوار معاشرہ کی تحویل میں رہیں نہ کہ افراد کی ذاتی ملکیت میں جس میں معاشرہ کوئی دخل نہ دے سکے۔ یاد رہے کہ یہ تصور کمیونزم یا سوشلزم کے تصور سے یکسر مختلف ہے جس میں انسان کی طبعی زندگی

کے علاوہ کسی اور زندگی کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کا نظامِ ربوبیت نہ سرمایہ داروں کے لئے خوش آئند ہوسکتا ہے نہ کمیونسٹوں کے لئے۔

یہ تھے دینِ خداوندی کے وہ خط وخال جنہیں طلوع اسلام.....نہایت مستقل مزاجی سے عوام کو دکھاتا رہا اور یہی تھی آہن کی وہ فسان جس سے ریت میں ملے ہوئے فولادی ذرات تڑپ تڑپ کر ریت سے الگ ہوگئے اور کہکشانی ستاروں کی طرح اس حیات آفریں پکار پر کھنچے چلے آئے۔

انہی افراد پر مشتمل تنظیمی ہیئت کا نام ''بزم طلوع اسلام'' ہے۔ ان بزموں کا مقصد اور مشن طلوع اسلام کی طرف سے پیش کردہ قرآنی فکر کو عام کرنا ہے۔

قرآنی پیغام کے عام کرنے کے سلسلہ میں ہمارے سامنے یہ حقیقت آئی کہ جب کوئی شخص جذبات سے مغلوب ہو جائے تو وہ کوئی معقول بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ اس موڈ میں ہی نہیں ہوتا کہ پیش آمدہ مسائل پر عقل وبصیرت کی رو سے غور کرے اور دلائل و براہین کے مطابق کسی فیصلے پر پہنچے۔ افراد کے مجموعے ہی کا نام قوم ہوتا ہے ور جب اقوام بھی جذبات کے سیلاب میں بہہ جائیں تو یہی چیز ان کی تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔ اس وقت ہماری قوم بھی تباہی کے اسی غار کی طرف رواں دواں چلی جارہی ہے اور بری طرح جذبات کے سیلاب میں بہی جارہی ہے۔ یوں تو مغرب کی خدا فراموش سیاست کی بدولت انتخابات کی وبا ہر جگہ آندھی بن کر اٹھتی اور جھکڑ بن کر چھا جاتی ہے۔ لیکن ہمارے یہاں بدقسمتی سے اس نے اور ہی شکل اختیار کرلی ہے۔ یہاں ایک طبقہ انسان کی طبیعی ضروریاتِ زندگی کے حصول کو اپنا مطمح نظر بنائے ہوئے ہے اور صرف اسی میں انسانیت کے فلاح و بہبود کا راز بتاتا ہے اور اس کے حصول کے لئے وہ اپنی ہر چیز کو داؤں پر لگائے بیٹھا ہے۔ دوسری طرف نظریۂ پاکستان کے مخالفین عوام کے ان جذبات کو مشتعل کرنے میں پوری شدت سے سرگرمِ عمل ہیں جن کا تعلق قلبِ انسان کے نہایت نرم و نازک گوشوں سے ہوتا ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحریکِ طلوعِ اسلام کے مقاصد کو ایک بار پھر دہرا دیا جائے۔ یہ ضرورت اس لئے اور بھی اہم ہو جاتی ہے کہ تحریکِ طلوع اسلام دینِ خداوندی کے فروغ اور نظامِ ربوبیت کے قیام وعمل کی پیامبر ہے ان حالات میں ایک طرف مذہب پرست طبقہ ہم سے متقاضی ہے کہ 'دین خطرہ میں ہے۔ اس لئے آپ ہمارے ساتھ مل کر ان کا مقابلہ کیجئے۔ دوسری طرف سرمایہ داری کے ظلم و استبداد اور مذہبی پیشوائیت کی خون آشامیوں' عیاریوں اور مکاریوں کا شکار طبقہ ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ تم نظامِ ربوبیت کے پیامبر ہو اس لئے سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کو دفن کرنے میں ہم سے تعاون کیوں نہیں کرتے۔ تیسری طرف تحریک میں شامل وہ نئے نوجوان ہیں جن کی بے تابیٔ تمنا دبی زبان سے یہ شکوہ کرتی ہے کہ قرآن کے نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے ہماری موجودہ رفتار نہایت سست ہے۔ اس کے لئے ہمیں باہر نکلنا چاہئے۔ سوشل ورک کرکے ہمیں عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنی چاہئیں اور یوں عوام کی طاقت حاصل کرکے غیر قرآنی نظامِ کہن کی جگہ دینِ خداوندی کا نفاذ کرنا چاہئے۔

اندریں حالات، ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ تحریکِ طلوع اسلام کے مقاصد، نصب العین اور اس کے حصول کے لئے طریقِ کار کو مختصر طور پر خود بانیٔ تحریک کے الفاظ میں پیش کر دیں۔

دستور اساسی و اصولی ہدایات برائے بزمہائے طلوع اسلام کی پہلی شق یہ ہے:۔۔

''بزمِ طلوع اسلام نہ کوئی سیاسی پارٹی ہے نہ مذہبی فرقہ، یہ ایک اجتماعی کوشش ہے اس قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے جسے ادارۂ طلوع اسلام کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ اسلام میں جو غیر قرآنی تصورات شامل ہو گئے ہیں، انہیں الگ کر کے پھر سے اس نظام کی تشکیل کے لئے فضا سازگار بنائی جائے جو عہد محمد رسول اللہؐ والذین معہٗ میں قائم ہوا تھا۔''

چنانچہ طلوع اسلام کی پہلی کنونشن منعقدہ 1956ء میں محترم پرویز صاحب نے اپنے خطاب میں فرمایا:

''اس کے بعد میں اس کے دوسرے گوشے کی طرف آتا ہوں جو اس پہلے گوشے سے بھی زیادہ نازک اور لطیف ہے۔ لطیف اتنا کہ بعض اوقات اسے صحیح طور پر سمجھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ گوشہ یہ ہے کہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت اور اس کے ذریعے معاشرہ میں انقلاب بغیر گروہ بندی اور پارٹی بازی کے برپا کیا جائے۔ چونکہ دورِ حاضرہ میں معمول یہ ہے کہ کوئی تحریک بغیر پارٹی بازی کے وجود میں نہیں آتی اس لئے یہ بات ذرا مشکل سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ پارٹی بازی کے بغیر بھی کوئی تحریک چل سکتی ہے۔ لیکن برادران! قرآن کریم سے جو کچھ تھوڑی بہت بصیرت میں نے حاصل کی ہے اس کی روشنی میں، میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ملت کے اندر تعمیری انقلاب پیدا کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ کوئی پارٹی بنائے بغیر ان میں فکری تبدیلی پیدا کرتے جائیں..... قرآن کریم غیر مسلموں کے مقابلہ میں مومنین کو الگ جماعت، ایک جداگانہ امت قرار دیتا ہے لیکن وہ اس امت کے اندر فرقہ سازی کو شرک قرار دیتا ہے، بعض احباب کہتے ہیں کہ قرآن مذہبی فرقہ کو تو شرک قرار دیتا ہے، سیاسی پارٹی کو شرک نہیں ٹھہراتا، ذرا سوچئے کہ جس اسلام میں مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے ہی نہیں اس میں مذہبی فرقہ اور سیاسی پارٹی میں کیا فرق ہو سکتا ہے؟ لہٰذا مذہبی فرقہ ہو یا سیاسی پارٹی دونوں تفریق فی الدین ہیں۔ پھر کہا یہ جاتا ہے کہ جو مقصد ہمارے سامنے ہے اس کے لئے اجتماعی کام کی ضرورت ہے، انفرادی کوششوں سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر پارٹی بنانا منع ہے تو یہ اجتماعی کام کس طرح سے ہو سکے گا۔ یہ اجتماعی کام منظم کوشش (Organised Effort) سے ہو سکے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہو گا کہ پارٹی بازی اور منظم کوشش میں کیا فرق ہے؟ اس فرق کو سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ قرآن نے تحزب (پارٹی بازی) کی نفسیات کو چند الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے جہاں کہا ہے کہ: كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (30:32)۔ پارٹی کی عمارت تعصب کی بنیادوں پر اٹھتی ہے اور دوسروں سے نفرت

کے جذبہ پر استوار ہوتی ہے۔ ہر پارٹی کے ممبر یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا بھر کی سعادتیں اور حسنات ان کی پارٹی میں جمع ہیں اور پارٹی سے باہر جتنے لوگ ہیں ان میں کوئی خوبی اور نیکی نہیں۔ اس سے ان کے اندر نخوت اور تکبر پیدا ہو جاتا ہے اور وہ دوسروں کو سخت ذلت اور حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ لیکن انہی ذلیل اور حقیر لوگوں میں سے جب کوئی ان کی پارٹی میں شامل ہو جاتا ہے تو وہ ہر قسم کے شرف و مجد کا حامل بن جاتا ہے۔ پھر اس میں دنیا بھر کی خوبیاں آ جاتی ہیں۔ اگر وہ پارٹی کے ساتھ وفا شعار (Loyal) رہتا ہے تو اس کا ہر عیب ہنر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اگر اس نے پارٹی سے قطع تعلق کر لیا تو نہ صرف یہ کہ اس کی ہر خوبی عیب بن جاتی ہے بلکہ دنیا بھر کے عیب اسکی طرف منسوب کر دیئے جاتے ہیں اور اسے جی بھر کر بدنام کیا جاتا ہے۔ یہی وہ ڈر ہے جس کی وجہ سے لوگ پارٹیوں کے ساتھ متمسک رہتے ہیں۔ اپنی پارٹی کی تقویت ہر رکن کا اولین فریضہ ہوتا ہے اور اس کے لئے ہر قسم کا جائز و ناجائز حربہ استعمال کرنا عین جہاد سمجھا جاتا ہے۔ دوسروں کی بات کتنی ہی معقول کیوں نہ ہو، وہ اسے کبھی نہیں سنتے اور اگر کبھی مجبوراً سننا پڑے تو اس کا تمسخر اڑاتے اور استہزاء کی ہنسی ہنستے ہیں۔ ان کی مجلسوں کا محبوب ترین مشغلہ دوسروں کی تذلیل و تحقیر ہوتا ہے، جس میں وہ بڑی لذت لیتے ہیں..... یہ ہیں وہ عناصر جن سے ایک پارٹی ترتیب پاتی اور قائم رہتی ہے۔ لیکن قرآنی نظام کے لئے منظم کوشش کا تصور اس سے یکسر مختلف ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے قرآنی نظام کی حقیقت کو سمجھ لیا ہے اور جن کی آرزو یہ ہے کہ یہ نظام پھر سے ملت میں متشکل ہو جائے، وہ سب سے پہلے اس کی بنیادی خصوصیات خود اپنے اندر پیدا کریں اور پھر اس نظام کے تصور کو دوسرے لوگوں تک پہنچائیں۔ اس نظام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ دنیا میں تمام افرادِ انسانیہ کی ضروریات زندگی پوری ہوں اور ان کی مضمر انسانی صلاحیتوں کی مکمل نشوونما ہوتی جائے۔ اس نظام کے متشکل کرنے والوں کا فریضہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیں اور دوسروں کی نشوونما میں اپنی ذات کی بالیدگی اور ارتقاء کا راز سمجھیں۔ ظاہر ہے کہ جو افراد اس مقصد کے حصول کے لئے منظم کوشش کرنے کے لئے اٹھیں، ان میں پارٹی بازی کی لعنتوں میں سے کسی کا شائبہ تک بھی نہیں ہوگا۔ وہ دوسروں سے نفرت نہیں، ہمدردی کریں گے۔ وہ ان کی بہبود کا سامان مہیا کرتے پھریں گے۔ وہ اس میں اپنے اور پرائے کی کوئی تمیز روا نہیں رکھیں گے۔ وہ اپنے کام کی ابتدا بے شک کسی ایک مقام سے کریں گے لیکن پوری نوعِ انسانی ان کی برادری اور ساری دنیا ان کا گھر ہوگی۔ ان کی مساعی، خدا کی صفتِ رب العالمینی کی مظہر ہوں گی۔ اس میں ان کے ذمہ زیادہ سے زیادہ ایثار اور قربانیاں ہوں گی اور دوسروں کے لئے بیش از بیش نفع بخشیاں اور راحت سامانیاں"۔

ایک دوسرے مقام پر پرویزؔ صاحب نے فرمایا:

''قرآنِ کریم اس نظام کے قیام کے لئے ذرائع بھی کوئی ایسے استعمال نہیں کرنے دیتا جو مستقل اقدار کے خلاف ہوں' اس کے نزدیک جس طرح غلط راستہ صحیح منزل تک نہیں پہنچ سکتا' اسی طرح غلط ذریعہ سے صحیح مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ وہ ذریعہ اور مقصد میں فرق ہی نہیں کرتا''۔

ایک اور مقام پر موصوف نے کہا:

''حقیقت یہ ہے کہ مادی نظریۂ حیات کی رو سے' انقلاب کے لئے تشدد کے علاوہ اور کوئی ذریعہ کارگر ہو نہیں سکتا لیکن قرآنی نظریۂ زندگی کی رو سے احترام انسانیت' انسانی ذات پر ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔ یہ ظلم و استبداد کی قوتوں کی دراز دستیوں کو روکنے کے لئے قوت کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ نظریۂ زندگی کی تبدیلی کے لئے قوت کے استعمال کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے کہ قوت کے استعمال سے نظریہ میں تبدیلی نہیں آسکتی۔ یہ تبدیلی یقین (Conviction) سے آتی ہے اور (Conviction) کی بنیاد دلائل و براہین کی رُو سے دل و دماغ کے اطمینان پر ہے۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں ایمان کہتے ہیں''۔

''دنیا میں ساری قوتوں کا راز' ایمان میں مضمر ہے۔ جس قدر آپ کا یقین محکم ہے اسی قدر ناقابلِ تسخیر قوتوں کے آپ مالک ہیں۔ شکست و کامرانی کا بنیادی مدار ساز و سامان پر نہیں' یقین اور عدمِ یقین پر ہے۔ جن لوگوں کو اپنے مقاصد کی صداقت پر غیر متزلزل یقین ہوگا وہی دنیا میں کامیاب و شادکام ہوں گے۔ یہی شکست و فتح کا اٹل پیمانہ ہے۔ اسی سے قوموں کا مستقبل ماپا جاتا ہے۔ جب یقین ایمان کے درجہ تک پہنچ جائے اور ایمان ہو اللہ واحد القہار پر تو پھر دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اپنے مقام سے نہیں ہلاسکتی''۔

''(نظام خداوندی) کے قیام کی پہلی منزل شعور کی بیداری ہے۔ شعور کی یہ بیداری اور فکر و نظر کی یہ تبدیلی اس نظام کے تصور کے عام کرنے میں اور اس کے درخشندہ اور تابناک نتائج کو نگاہِ بصیرت کے سامنے لانے سے ہوتی ہے۔ اسی کا نام تعلیم کتاب و حکمت ہے۔ نبیٔ اکرم ﷺ نے اسی نقطۂ سے آغاز کار کیا تھا..... اس تصور کو عام کرنے سے ایسے' سعادت مند افراد نتھر کر الگ ہو جاتے ہیں جن کی نگاہوں میں کشادگی اور قلب میں وسعت ہوتی ہے۔ اسی کا نام نفس کی بالیدگی ہے اور تعلیم و حکمت کے ساتھ اس کا چولی دامن کا تعلق ہے''۔

تعلیم و حکمت کی وضاحت کرتے ہوئے پرویزؔ صاحب نے لکھا:

''تعلیم کا تعلق بالعموم انسانی ذہن سے ہوتا ہے اور تزکیہ کا تعلق قلبِ انسانی سے۔ کسی حقیقت کو اس انداز سے واضح کر دینا کہ وہ دوسرے کی سمجھ میں آجائے' تعلیم ہے۔ تعلیم سے ذہنی بصیرت تو حاصل ہوسکتی ہے قلبی ایقان نہیں۔ دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے ذہنی جلا ہی کافی نہیں ہوتی' اس کے لئے قلبی تبدیلی

کی ضرورت ہوتی ہے جو درحقیقت اعمالِ انسانی کا سرچشمہ ہے' جس سوسائٹی کے نظام کی بنیاد تزکیۂ قلب و تطہیرِ فکر پر نہیں وہ نظام کبھی نشوونما ارتقاء انسانیت کا کفیل نہیں ہوسکتا۔ اس کا نتیجہ ہمیشہ فساد ہوگا۔ بہترین دساتیر وقوانین بھی اطمینان بخش نتائج مرتب نہیں کرسکتے جب تک ان قوانین کو نافذ کرنے والی جماعت اور ان پر عمل کرنے والی قوم کے قلب ونگاہ کی اصلاح نہ ہوچکی ہو۔ عمل کا محرک جذبہ' قوتِ ارادی ہے اور قوتِ ارادی کا تعلق دل سے ہے' دماغ سے نہیں۔ اس لئے تنہا علم عمل کا محرک نہیں ہوسکتا۔ قرآن اس قسم کی سوسائٹی تشکیل کرتا ہے جو اطاعتِ احکام میں اپنی ذات کی تسکین محسوس کرے۔ قلب کی اس کیفیت کا نام تزکیہ ہے۔ جب قرآن قلب کی گہرائیوں میں اتر جائے تو انسان کی نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے اور داخلی دنیا کی اس تبدیلی سے خارجی دنیا میں انقلابِ عظیم آجاتا ہے۔ قرآن یہی انقلاب پیدا کرتا ہے''۔

(موصوف نے کہا)۔ ''قرآنی انقلاب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہنگامی شورشیں برپا کرنا نہیں سکھاتا۔ وہ اپنی اساس فکری تبدیلی پر رکھتا ہے جسے وہ علیٰ وجہ البصیرت پیدا کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ان جذبات کی بھی حسن کارانہ انداز سے پرورش اور تربیت کرتا ہے جو انقلاب کے محرک ہوتے ہیں۔ وہ قلب اور دماغ' عقل اور عشق' جنون اور خرد' ذکر اور فکر' خبر اور نظر' دلائل اور جذبات کے صحیح امتزاج سے داخلی اور خارجی دنیا میں ایسی تبدیلی پیدا کرتا ہے جس میں ہر قدم تعمیر کے لئے اٹھتا ہے اور جو چیزیں بظاہر تخریبی نظر آتی ہیں' وہ بھی درحقیقت تعمیر ہی کی تمہید ہوتی ہیں۔ ''جنون اور خرد'' جیسے متضاد عناصر میں ہم آہنگی پیدا کر کے انہیں ایک بے پناہ قوت کا امین بنا دینا قرآن کی بنیادی خصوصیت ہے۔۔۔ اس قسم کا عقل اور جنون کا امتزاج جس میں نہ تو جنون مذہبی دیوانگی سکھا دے اور نہ ہی عقل اس جنون کی چنگاری کو اپنی خاکستر کے نیچے دبا کر بجھا دے' قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ یہی ہیں وہ اربابِ ''خرد وجنون'' جنہیں وہ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰي جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ (3:190) سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی وہ اربابِ عقل وبصیرت جو زندگی کی ہر ساعت اور ہر گوشے میں وحی کی راہنمائی کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں اور کائنات کی گہرائیوں اور بلندیوں پر بھی غور وفکر کرتے ہیں' یہی ہیں وہ مکمل عدل کا ''خواب'' دیکھنے والے جو اس ''خواب'' کو ایک زندہ حقیقت بنا کر رکھ دینے کے اہل ہوں''۔

طلوعِ اسلام کی دوسری سالانہ کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے پرویزؔ صاحب نے فرمایا:

''جو جماعت قرآنی نظامِ ربوبیت کی تشکیل کا عزم لے کر اٹھتی اور اپنے اللہ سے بیع وشریٰ کا معاملہ کرتی ہے اس کے نفع اور نقصان کے ماپنے کے پیمانے اور اندازے دوسری جماعتوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ عام جماعتوں کو صرف یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ انہوں نے کتنے ممبر بھرتی کئے۔ کس قدر روپیہ فراہم کیا۔

کتنے جلسے کئے، کتنے جلوس نکالے، مخالفین کو دبانے کے لئے کون کون سے حربے استعمال کئے اور اس طرح انتخابات میں کتنی نشستیں حاصل کیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن قرآنی نظام کی داعی جماعت کے افراد کو دیکھنا یہ ہوگا کہ انہوں نے اپنے اندر کس قدر تبدیلی پیدا کی ہے۔ ان کا قلب و دماغ کس حد تک قرآنی تصورات سے ہم آہنگ ہو چکا ہے۔ ان کی سیرت و کردار کہاں تک قرآنی قالب میں ڈھل چکے ہیں۔ ان کی آرزوؤں اور ارادوں کے محرکات کس حد تک قرآنی مقاصد ہیں، وہ اپنی ذات، اپنے اعزہ و اقارب اور دوسرے انسانوں کے ساتھ معاملات میں قوانینِ خداوندی کی کس قدر نگہداشت کرتے ہیں۔ اگر ہمارے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تو پھر آپ نے دوسرے معیاروں کے مطابق کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لی ہو، قرآن کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں''۔

طلوع اسلام کی ساتویں کنونشن میں موصوف نے کہا:

''انسانی تاریخ میں یہ وقت بڑا نازک آیا ہے، قدیم تصوراتِ حیات اور نظامہائے زندگی کا دور دورہ ختم ہو رہا ہے، ملوکیت، سرمایہ داری، مذہب، سب ایک ایک کر کے اٹھتے اور مٹتے جا رہے ہیں..... اس وقت لاّ کی طوفانی قوتیں (کمیونزم وغیرہ) بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ اگر الا اللہ کا تصور اس وقت سامنے نہ لایا گیا تو انہیں اس کے بعد ان کے مقام سے ہٹانے، یا الا اللہ تک لانے میں نہ معلوم کتنا وقت لگ جائے اور انسانیت کو کتنا عرصہ اس جہنم میں گزارنا پڑے جس میں وہ صدیوں سے پڑی جھلس رہی ہے''۔

طلوع اسلام کی نویں کنونشن کو خطاب کرتے ہوئے پرویزؔ صاحب نے فرمایا:

''یہ ہے عزیزانِ گرامی قدر! مختصر الفاظ میں میری وہ دعوت جسے میں قریب تیس سال سے مسلسل پیش کئے چلا آ رہا ہوں۔ جس دن میں نے اس قرآنی فکر کو پیش کرنے کا فیصلہ کیا تھا، مجھے اس کا اچھی طرح سے علم تھا کہ اس کی کس قدر مخالفت ہوگی۔ جو شخص لوگوں کے سامنے ان کے مروجہ عقائد اور متوارث نظریات پیش کرتا ہے، پہلے ہی دن ایک انبوہِ کثیر اس کے ساتھ ہوتا ہے، اسے ان کا مسلمہ لیڈر، راہنمائے شریعت یا مرشد طریقت بن جانے میں کسی قسم کی کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ لیکن جو شخص ان کے غلط عقائد اور غیر صحیح اعمال کی تردید کر کے، انہیں ایسے راستے کی طرف دعوت دیتا ہے جو ان کی پامال راہوں سے ہٹا ہوا ہے، وہ دنیا بھر کی مخالفت مول لیتا ہے۔ میری اپنی پہلی زندگی خود انہی پامال راہوں میں گزری تھی اس لئے ایک ہجوم کو اپنے پیچھے لگا لینا، اور ایک بہت بڑی جماعت کھڑی کر کے اسکا قائد بن جانا، میرے لئے کچھ بھی مشکل نہیں تھا لیکن میری قرآنی بصیرت کچھ اور کہہ رہی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے توفیق بخشی کہ میں ان تمام نگاہ فریب جاذبیتوں اور دامن گیر کششوں سے منہ موڑ کر، قرآن کی آواز پر لبیک کہوں، اور اس طرح دنیا جہان کی مخالفت مول لے لوں، میں نے یہ فیصلہ

سب کچھ جانتے بوجھتے، سوچتے سمجھتے کیا اور مجھے کبھی اس پر افسوس نہیں ہوا۔

سوال یہ ہے کہ میں نے مقبولیتِ عامہ کا وہ آسان راستہ چھوڑ کر ان پُرخار وادیوں کو اختیار کیوں کیا۔ اس کا بنیادی جواب تو یہی ہے کہ جب کسی کے سامنے صداقت آ جائے تو خود صداقت کا تقاضا ہوتا ہے کہ اسے عام کیا جائے خواہ اس میں کتنی ہی مشقتیں کیوں نہ برداشت کرنی پڑیں۔ دوسرے یہ کہ تاریخِ اقوام کے مطالعہ سے میں اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ اب مذہب کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اے مذہب تاریکیوں میں پنپتا ہے جوں جوں علم کی روشنی پھیلتی جاتی ہے، مذہب چمگادڑ کی طرح آنکھیں بند کرتا چلا جاتا ہے۔ بادنیٰ تدبر یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ دنیا کے تمام مذاہب ایک ایک کر کے ختم ہو گئے یا ختم ہوتے جا رہے ہیں۔۔۔ بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔

یہ تو دین کا خاصا ہے کہ وہ علم کی روشنی میں اور زیادہ چمکتا ہے۔ جیسے کہ میں نے شروع میں کہا ہے ہم بھی اپنے دین کو مذہب کی سطح پر لے آئے ہیں، اس لئے جب دنیا کے دیگر مذاہب باقی نہ رہے، تو یہ مذہب کیسے باقی رہ سکے گا؟ فطرت کے قانون کے مطابق، ہر وہ نظریہ جو زمانے کے تقاضوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔

مذہب کے ختم ہو جانے کے بعد، اگر اس قوم کے سامنے دین نہ ہو، تو وہ دہریت اختیار کر لیتی ہے، اس وقت یورپ کی سیکولر مملکتوں اور کمیونسٹ سلطنتوں کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ ان دونوں میں سیاست، مستقل اقدار سے الگ ہو جاتی ہے اور اس کا نتیجہ (علامہ اقبالؔ کے الفاظ میں) ''چنگیزیت'' کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

دہریت کا خاصا یہ ہے کہ وہ خاص اسی قوم کو تباہ نہیں کیا کرتی، اس کا اثر بڑا دوررس ہوتا ہے۔ جب اقتدار کسی ایسی قوم کے ہاتھ آ جائے جو مستقل اقدارِ حیات پر ایمان نہ رکھتی ہو، تو اس سے دنیا جس جہنم میں مبتلا ہو جاتی ہے اس کے شعلے ہم آج ساری دنیا میں مشتعل دیکھ رہے ہیں۔ میری نگہِ بصیرت یہ دیکھ رہی ہے کہ مذہب کے ساتھ جو کچھ یورپ میں ہوا ہے، وہی کچھ اب پاکستان میں ہونے والا ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ اگر اس وقت قوم کے سامنے خدا کا دین نہ لایا گیا تو یہاں بھی دہریت چھا جائے گی۔ میری انتہائی آرزو اور کوشش یہ ہے کہ قبل اس کے کہ دہریت کا بڑھتا ہوا سیلاب ادھر کا رخ کرے، یہاں مذہب کو دین سے بدل دیا جائے تاکہ دنیا میں ایک خطہ زمین تو ایسا ہو جو خدا کی پروردگاری کا مظہر بن سکے''۔

طلوعِ اسلام کی دسویں سالانہ کنونشن میں پرویزؔ صاحب نے اراکین بزمہائے طلوعِ اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''میں نے زمیلانِ گرامی قدر! قرآن کریم کی اس روشنی کو چراغِ راہ بناتے ہوئے اس تحریک کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کا مقصد، نہایت سکون و خامشی، لیکن انتہائی التزام و استحکام کے ساتھ، قرآنی فکر کو عام کئے جانا

ہے۔ اس میں کسی قسم کی ہنگامہ آرائی اور تماشہ گری کا کوئی دخل نہیں۔ ہمارے دستور اساسی کی ایک شق یہ ہے کہ ہم عملی سیاسیات میں حصہ نہیں لیں گے اس لئے اس تحریک کے ساتھ وابستگی سے نہ تو کوئی سیاسی مفاد عاجلہ حاصل ہو سکتے ہیں اور نہ ہی اس میں نمود و نمائش کی کوئی گنجائش اور شہرت و ناموری کا کوئی مقام ہے۔ یہاں تو دنیا بھر کی مخالفت کو نہایت سکون و اطمینان سے برداشت کرنا' اور لب تک ہلائے بغیر اپنی دھن میں آگے بڑھتے چلے جانا ہے' اس بزمِ شوق میں پروانے کی طرح جل کر مر جانا اور زبان سے اُف تک نہ کرنا ہے' دوسری طرف مفاد عاجلہ کے جہانِ رنگ و بو سے یوں بیگانہ وار گزر جانا ہے کہ اس کی کوئی کشش و جاذبیت آپ کی دامنگیر نہ ہو''۔

یہ ہیں قرآنی حقائق پر استوار اس تنظیم کے مقاصد' اور یہ ہے وہ مخصوص اور متعین طریقِ کار (ذہنی انقلاب اور پھر قلبی انقلاب) جسے اس تحریک نے اپنے روزِ اول سے اختیار کر رکھا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں آپ خود فیصلہ فرما لیجئے کہ اس قسم کی تحریک آپ کے تعاون کی مستحق ہے یا نہیں۔

والسلام!

ضرورتِ رشتہ

بیٹا 28 سال گورنمنٹ ملازم (POF) گریڈ 12 تعلیم (DAE) (ایف ایس سی) اور بیٹا عمر 26 سال گورنمنٹ ملازم گریڈ 16 تعلیم ایم اے، مستقل رہائش راولپنڈی کے لئے قرآنی گھرانوں سے رشتے مطلوب ہیں۔ تمام معاملات قرآنی احکام کے مطابق ہوں گے۔

برائے رابطہ فون نمبر: 0320-1767734

سانحہ ارتحال

بزم طلوعِ اسلام پنج کسی، خانیوال کے رُکن جناب لیاقت علی اعوان کی والدۂ محترمہ 12 جنوری 2017ء کی شام وفات پا گئی ہیں۔ مرحومہ بزم طلوعِ اسلام پنج کسی، خانیوال کے سابق نمائندہ محمد حسین آزاد مرحوم کی بھاوج تھیں۔ دُعا ہے کہ اللہ تبارک مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنت عطا کرے اور پس ماندگان کو صبر و جمیل سے نوازے۔ بزم طلوع اسلام پنج کسی کے احباب اور ادارہ مرحومہ کے اہل خانہ و لواحقین کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

ملک منظور حسین لیل۔ بھکر
0332-7636560
mhleeladv@yahoo.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قسط نمبر 16

پرویز صاحب کا نظریۂ اسلامی مملکت

(قرآنی حکومت)

اور جو لوگ ما انزل اللہ (قرآن) کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، وہی لوگ کافر، ظالم، فاسق ہیں (5:44-45-47)

بنیادی انسانی حقوق

انسانی حقوق کا تحفظ:

طلوعِ اسلام ستمبر 1971ء، ص:28، غلامی کی بہت سی شکلیں ہیں ''جن کا تعلق انسانی حقوق سے ہے۔۔سورہء البلد میں ہے کہ ہم نے انسان کو دونوں راستے دکھا دیئے۔ایک راستہ سہل انگاریوں، مفاد پرستیوں اور عیش سامانیوں کا ہے۔''کنارِ آب رکنا بادگل گشت و مصلّٰی۔'' کا راستہ۔۔۔دوسرا راستہ ''العقبۃ'' کا ہے۔یعنی پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنے کے مرادف۔پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنے کا راستہ بڑا دشوار گزار ہوتا ہے۔اس میں قدم قدم پر سانس پھولتی ہے لیکن ہر قدم، انسان کو پہلے سے زیادہ بلندی کی طرف لے جاتا ہے۔یہ راستہ کیا ہے؟۔(1) فَكُّ رَقَبَةٍ (90:13) جو گردنیں کسی دوسرے کی محکومی میں جکڑی ہوئی ہوں، انہیں اس سے آزاد کرانا۔(2) اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ (90:14) جس زمانے میں افلاس وغربت عام ہو جائے، اس میں دوسروں کے کھانے پینے کا انتظام کرنا۔۔کن لوگوں کے کھانے پینے کا؟۔۔(3)۔ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ (90:15)۔ان کا جو اس قدر بھرپور معاشرہ میں بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کریں۔اور (4) اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ (90:16) یا ان محنت کشوں کا جو دن بھر خاک آلود رہنے کے باوجود اس قابل نہ ہو سکیں کہ ان کی زندگی کی گاڑی آگے چلے۔۔۔یہ ہے وہ ''الدین''۔یعنی وہ گھاٹی جس پر چڑھنا دشوار ہے۔ان میں سے شق اوّل ہمارے موضوعِ زیرِ نظر سے متعلق ہے۔یعنی'' فک الرقبۃ''۔زمانہ نزول قرآن میں (جسے دورِ جہالت کہا جاتا ہے) غلامی کی ایک ہی شکل تھی جسے عرفِ عام میں (slavery) کہا جاتا ہے۔قرآن کریم نے ان غلاموں کو چھڑانے کے لئے مختلف طریق تجویز کئے۔اور آئندہ کے لئے غلامی کا خاتمہ کر دیا۔دنیا آج بڑے فخر سے کہتی ہے کہ اس نے غلامی کو مٹا دیا ہے۔۔۔لیکن اس زمانے میں، جسے دورِ تہذیب کہا جاتا ہے، غلامی کی ایسی ایسی شکلیں وضع کی گئی ہیں جن کا تصور بھی اُس (دورِ جہالت) میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔۔ان

شکلوں کی تفصیل تو طول طویل ہے لیکن ان سب میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ جن حقوق کو قرآن نے بنیادی حقوق انسانیت قرار دیا ہے، انہیں سلب کر لیا جاتا ہے۔ اور اکثر اوقات سلب بھی اس انداز سے کیا جاتا ہے کہ جسے مصلوب کیا جاتا ہے، اسے اس کا احساس تک نہیں ہونے پاتا، یا نہیں ہونے دیا جاتا۔ ان سلب کردہ حقوق کا بحال کرانا بھی ''فک رقبۃ'' میں آجائے گا۔

مظلوموں کی امداد کیلئے جنگ:۔ ہمارے زمانے میں (U.N.O) نے بنیادی حقوقِ انسانیت کا منشور شائع اور اختیار کر رکھا ہے۔ لیکن اس کی رو سے، کمزور انسانوں اور قوموں کے حقوق کا جس انداز سے تحفظ ہوتا ہے، وہ ظاہر ہے۔ یہ فریضہ جماعتِ مومنین ہی ادا کر سکتی ہے۔ ان حقوق کی شدید ترین پامالی کو قرآن، ظلم سے تعبیر کرتا ہے۔ اور مظلوموں کی امداد کے لئے (عندالضرورت) جنگ کے لئے اٹھنا، جماعتِ مومنین کا فریضہ قرار دیتا ہے۔ (مثلاً) جب مدینہ میں مسلمانوں کی مملکت قائم ہوگئی تو وہ قریشِ مکہ کے دستِ تظلم سے محفوظ ہو گئے۔ لیکن مکہ میں ایسے مسلمان رہ گئے جنہیں وہ اپنے جور و استبداد کا تختۂ مشق بناتے تھے۔۔ قرآن کریم نے مسلمانانِ مدینہ کو مخاطب کر کے کہا کہ:۔

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم قتال فی سبیل اللہ کے لئے اٹھتے نہیں حالانکہ حالت یہ ہے کہ (مکہ کے) کمزور و تاتواں، بے کس و بے بس مسلمان۔۔ مرد، عورتیں، بچے، چلا چلا کر کہہ رہے ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو ہمیں اس بستی سے نکالنے کی کوئی صورت پیدا کر دے جس کے رہنے والے اس قدر ظالم اور سفاک ہیں تو اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار بھیج جو ہمیں ان کے جور و ستم سے نجات دلائے۔ (4:75)۔۔۔ چنانچہ مدینہ کے مسلمان اٹھے اور انہوں نے، مکہ فتح کر کے، اِن مظلوموں کو اُن کے مظالم سے نجات دلائی۔ قرآن کریم نے اس واقعہ کے بیان کرنے سے اس ابدی اصول کی وضاحت کر دی کہ اسلامی مملکت کا فریضہ یہ بھی ہے کہ دنیا میں کسی قوم اور کسی ملک کے مظلوموں کی فریاد ان تک پہنچے، وہ ان کی مدد کے لئے اٹھیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے ایران کے کسریٰ اور روم کے قیصر کو جو دعوت نامے ارسال فرمائے تھے، ان میں یہی کہا گیا تھا کہ تمہاری مملکت میں کسانوں پر جو ظلم ہو رہے ہیں، اگر تم نے ان کا تدارک نہ کیا تو اس کی سزا تمہیں بھگتنی پڑے گی۔ اس قسم کی جنگیں، اس لحاظ سے مدافعانہ کہلائیں گی کہ یہ اُن مظلوموں کی مدافعت کے لئے لڑی جائیں گی۔

فساد روکنے کیلئے جنگ:۔ اسی قسم کی مدافعانہ ایک اور جنگ بھی ہے۔ جسے قتال فی سبیل اللہ کہا گیا ہے۔ سورۃ البقرہ میں (حضرت) طالوت اور جالوت کے معرکہ کے تذکرہ کے بعد فرمایا:۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (2:251)۔ اگر خدا ایسا انتظام نہ کرے کہ ایک سرکش اور امن شکن گروہ کی جارحیت کی روک تھام، دوسرے گروہ کے ہاتھوں کرائی جائے، تو زمین میں ہر طرف فساد ہی فساد برپا ہو جائے۔ لیکن چونکہ خدا اہلِ عالم پر اپنا فضل رکھنا چاہتا ہے، اس لئے فساد برپا کرنے والوں کی دراز دستیوں کی روک تھام دوسرے لوگوں کے ہاتھوں سے ہوتی رہنی چاہیئے۔ اور ظاہر ہے کہ خدا کا یہ پروگرام اولاً اور تاسیساً جماعتِ مومنین کے ہاتھوں پورا ہوگا کہ انہی کو اس نے حزب اللہ (اللہ کی پارٹی) کہہ کر پکارا ہے۔۔ اور کہا ہے کہ: قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ (9:14)۔ تم ان

کے خلاف جنگ کے لئے اٹھو اس لئے کہ خدا چاہتا ہے کہ ان مستکبرین کو ان کی سرکشی کی سزا تمہارے ہاتھوں سے دلائے اور ان کی گردن جھکائے تاکہ وہ پھر فساد کے لئے نہ اُٹھ سکیں۔'' اس سے آگے پرویز صاحب نے قرآن کریم کی جامع اصطلاح ''فساد'' کی بڑی خوبصورت وضاحت کی ہے (مؤلف)۔

بنیادی حقوقِ انسانیت:

طلوعِ اسلام فروری 1937ء، ص:38 ''ہمارے زمانے میں بنیادی حقوقِ انسانیت۔۔۔ Fundamental Human Rights۔ کا بڑا چرچا ہے اور اقوامِ متحدہ (U.N.O) کا سب سے بڑا کارنامہ یہ بتایا جاتا ہے کہ اس نے ان حقوق کو متعین کر کے ان کا چارٹر شائع کر دیا ہے (Quoted by Dixon, in, The Human Situation.P/428) لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ بنیادی حقوق کا تصور سب سے پہلے قرآن کریم نے دیا تھا۔ اور انہیں نہایت وضاحت سے بیان بھی کر دیا تھا۔ قلتِ وقت کی بناء پر، میں ان حقوق کی تفصیل میں نہیں جا سکتا۔ اس لئے اجمالاً چند ایک کے تذکرہ پر اکتفاء کروں گا۔ دیکھئے قرآن کریم کی رو سے وہ حقوق کیا ہیں:

(1) تکریمِ انسانیت: یعنی ہر انسانی بچہ۔ محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں تکریم کا مستحق ہے۔ (2) جنسی مساوات: زندگی کے کسی شعبہ میں مرد اور عورت میں کوئی تفاوت نہیں (3) مدارج کا تعین افراد کے جوہر ذاتی اور سیرت و کردار کی رو سے کیا جائے گا۔ (4) اطاعت صرف قانون کی ہوگی۔ اشخاص کی نہیں۔ (5)۔ ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا حق ادا کیا جائے گا۔ اسے عدل کہا جاتا ہے۔ اور جس شخص میں کوئی کمی ہوگی اس کی کمی پوری کی جائے گی۔ اسے احسان کہا جاتا ہے۔ (6) ہر شخص کو رزق (سامانِ زیست) مہیا کرنے کی ذمہ داری مملکت پر ہوگی۔ (7) جان کی حفاظت کا حق۔ (8) جو چیز قانوناً کسی کی ملکیت میں جائے، اس کی حفاظت کا حق۔ (9) سکونت کا حق۔ (10) عصمت کی حفاظت کا حق۔ (11) شادی میں انتخاب کا حق۔ (12) حسن ذوق (Aesthetic Taste) کا حق۔ (13) مذہبی آزادی کا حق۔ (14) سچی بات کہنے کا حق۔ (15)۔ مظلوم کو فریاد کا حق (16) پرائیویسی کا حق (17) حیثیتِ عرفی کے تحفظ کا حق (18) اثباتِ جرم کے بغیر، ہر ایک کو بے گناہ تصور کئے جانے کا حق۔ (ان تمام حقوق کے قرآنی حوالے میرے مجموعہ مضامین ''بہارِ نو'' میں ملیں گے)۔۔ یہ اور اسی قسم کے دیگر حقوق کا تعین قرآن کریم نے اُس زمانے میں کیا جب دنیا میں افراد کے حق کا تصور بھی کہیں نہیں تھا۔ آپ غور کیجئے کہ کیا اس چودہ سو سال کے عرصہ میں، انسانی فکر نے ان حقوق کا تقاضا کیا ہے یا اس نے ان کے خلاف بغاوت کی ہے!۔ اور اگر اس نے ان حقوق کا مطالبہ کیا ہے تو کیا یہ اسلام کی کامیابی کی دلیل ہے یا اس کی ناکامی کا ثبوت؟۔ اسلام کی ناکامی تو ایک طرف، فکرِ انسانی اس باب میں ہنوز اسلام سے پیچھے ہے۔ اسلام نے ان حقوق کو ابدی اور غیر متبدل قرار دیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسانوں کا کوئی نظام ان میں تغیر و تبدل نہیں کر سکتا۔'' اقوامِ متحدہ کے منظور کردہ بنیادی حقوق کے چارٹر کے بارے میں پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ دنیا میں ان کی مٹی پلید کی جا رہی ہے۔ وہ شکاگو یونیورسٹی کے ایک

پروفیسر کا حوالہ دیتے ہیں کہ:۔ تجربہ نے بتایا ہے کہ اس باب میں کسی قوم پر بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہر حال میں حقوقِ انسانیت کا احترام کرے گی۔ گذشتہ دنوں اقلیتوں پر جس قدر مظالم کئے گئے ہیں، ان سے انسانی ضمیر کانپ اٹھتا ہے۔۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ:۔۔۔ ''یہ اس لئے کہ دنیا کی ہر مملکت اپنے آپ کو اقتدارِ مطلق (ساورنٹی) کی مالک سمجھتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اگر ان حقوق کو پامال کر دے، تو اس سے کوئی باز پرس کرنے والا نہیں ہوگا۔ ان کے برعکس، قرآنی مملکت پر مستقل اقدارِ خداوندی کا کنٹرول ہوتا ہے اور وہ اپنے ہر فیصلہ اور عمل کے لئے قانونِ مکافات کی عدالت میں جواب دہ ہوتی ہے۔۔ فکرِ انسانی کا تجرباتی طریق ہنوز اس مقام تک نہیں پہنچا جس کی وجہ سے بنیادی حقوق کے چارٹر تو شائع ہو جاتے ہیں، ان پر عمل درآمد کہیں نہیں ہوتا۔''

قرآنی بنیادی حقوق: طلوعِ اسلام ستمبر 1983ء۔ صفحہ نمبر 39: ''اصولاً، ہر حق کسی نہ کسی ذمہ داری کے پورا کرنے کے نتیجہ میں قائم ہوتا ہے۔ مثلاً، مومن اور خدا کے مابین جس معاہدہ کا قرآن کریم میں ذکر ہے (یعنی مومن اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے اور خدا اسے جنت عطا کر دیتا ہے) تو مومن جنت کا حقدار اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب وہ اپنی ذمہ داری کو پورا کرے۔ لیکن اس اصول میں بعض مستثنیات بھی ہیں جن میں حق، بغیر ذمہ داری کے واجب ہو جاتا ہے۔ مثلاً جو شخص کام کرنے کے قابل نہ رہے، وہ مملکت سے سامانِ زندگی بطور حق طلب کر سکتا ہے (فی اموالھم حق مظلوم للسائل والمحروم) نیز بعض حقوق خاص شرائط کے ساتھ مشروط ہوتے ہیں۔ مثلاً جان کی حفاظت ہر فردِ معاشرہ کا حق ہے۔ لیکن جرمِ قتل کی سزا میں، اسے اس حق سے محروم کیا جا سکتا ہے۔۔ قرآن کریم میں حقوق کی کوئی الگ فہرست نہیں دی گئی۔ اس نے مستقل اقدار کا ذکر کیا ہے جن کا تحفظ اسلامی مملکت کا فریضہ ہوتا ہے۔ انہی اقدار (یا مملکت کی ذمہ داریوں) سے حقوق مستنبط کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً:

(1) احترامِ آدمیت:

ہر انسانی بچہ، محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں طور پر عزت کا مستحق ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ ''ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو واجب التکریم پیدا کیا ہے (17:70) اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ افرادِ مملکت کی قیمت متعین کرنے (یعنی معاشرہ میں ان کا مقام مقرر کرنے) میں ان کی پیدائش (حسب نسب) کے اعتبار سے کوئی تفریق و تخصیص نہیں کی جائے گی۔

(2) جنسی مساوات:

قرآن کی رو سے جنسی تفریق نہ وجہِ ذلت ہے نہ باعثِ امتیاز۔ یعنی نہ مرد، محض مرد ہونے کی حیثیت سے، عورتوں سے افضل ہیں اور نہ عورتیں، محض عورت ہونے کی حیثیت سے مردوں سے کمتر۔ فطری وظائف کے اعتبار سے ان کے فرائضِ زندگی میں فرق ضرور ہے لیکن جس مقام کا مستحق ایک ''انسان'' ہے اس میں مرد اور عورت دونوں یکساں طور پر شریک ہیں۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے دروازے ایک صنف کے لئے کھلے رہیں اور دوسری پر بند کر دیئے جائیں۔

(3) مدارج کا معیار:

جوہر ذاتی، معاشرہ میں ہر فرد کا مقام اس کے جوہر ذاتی اور حسنِ کردار کی بناء پر متعین کیا جائے گا: وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (46:19) قرآن کی مستقل قدر ہے۔ یعنی ہر ایک کے مدارج اس کے اعمال کے مطابق۔ اسلامی مملکت میں تعینِ مدارج کا کوئی دوسرا معیار نہیں ہوسکتا۔ ہر شخص کا حق ہے کہ اسے اس کی صلاحیتوں کے مطابق مقام عطا ہو۔

(4) حقِ آزادی:

قرآن کی رو سے آزادی سے مفہوم یہ ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہ ہو۔ محکومیت صرف قوانینِ خداوندی کی ہو (3:78) لا الٰہ الا اللہ اس آزادی کا منشور ہے۔ یعنی صاحبِ اقتدار صرف خدا ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں۔

(5) عدل واحسان:

عدل کے معنی ہیں ہر شخص کو اس کا حق مل جانا۔ اور احسان کے معنی ہیں جس شخص میں کوئی کمی رہ جائے، اس کمی کا پورا کر دینا۔ عدل اور احسان، اسلامی مملکت کا فریضہ ہے (16:90) اور افرادِ مملکت کا حق۔

(6) رزق (سامانِ زیست) کا حق:

ہم دیکھ چکے ہیں کہ افرادِ معاشرہ کو ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانا مملکت کا بنیادی فریضہ ہے۔ فلہٰذا، افرادِ معاشرہ کا حق۔ لیکن یہ حق مشروط ہے اس شرط کے ساتھ کہ کام کرنے کے قابل ہر فرد، اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق وہ کام سر انجام دے جسے اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ سامانِ زیست میں وہ اسباب وذرائع بھی شامل ہیں جو انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے ضروری ہیں۔ مثلاً (علاج اور) تعلیم وتربیت (وغیرہ)۔ اسے ہر انسانی بچہ بطور استحقاق طلب کرسکتا ہے۔

(7) جان کی حفاظت:

افرادِ معاشرہ کی جان کی حفاظت، اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔ لیکن جب جرم کی پاداش میں سزائے موت دی جائے تو مجرم کا یہ حق سلب ہوجاتا ہے۔ اور جنگ کی صورت میں اپنی جانوں کو خود پیش کر دینا، مومنین کے اس معاہدہ کی شرط ہوتا ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

(8): مال کی حفاظت:

جان کی حفاظت کے بعد، ان چیزوں کی حفاظت بھی مملکت کا فریضہ ہے جو مملکت کی اجازت سے افراد کے ذاتی تصرف میں رہیں۔ کوئی اس کا مجاز نہیں ہوتا کہ جو کچھ مملکت کی طرف سے کسی ایک فرد کے تصرف میں رہنے کے لئے دیا گیا ہے اسے دوسرا فرد زبردستی اپنے قبضہ میں لے لے (4:29)۔

(9) سکونت کی حفاظت:

ضروریاتِ زندگی میں، جن کا بہم پہنچانا مملکت کا فریضہ ہوتا ہے، رہائش کا انتظام (مکان) خود بخود آجاتا ہے۔ اس لئے

کسی کو سکونت سے محروم کر دینا اس کے اس حق کو سلب کر لینا ہے (2:85)۔

(10) عصمت کی حفاظت:

عصمت، انسان کا شرف ہے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جس کا حیوانات میں احساس تک نہیں ہوتا۔ لہٰذا، قرآن کریم اس کی حفاظت کو بنیادی اور غیر مشروط حق قرار دیتا ہے (33:60، 24:2)۔

(11) شادی میں انتخاب کا حق:

مرد اور عورت کے مابین، قوانینِ خداوندی کے مطابق، ازدواجی زندگی بسر کرنے کے معاہدہ کا نام نکاح ہے۔ اور ظاہر ہے کہ معاہدہ کے لئے فریقین کی رضامندی ضروری ہے۔ اس لئے قرآن تاکید کرتا ہے کہ یہ معاہدہ فریقین کی رضامندی سے ہونا چاہیئے (4:3، 4:19) اور ظاہر ہے کہ جس طرح اس معاہدہ کے استوار کرنے میں فریقین کو برابر کا حق حاصل ہے اسی طرح عندالضرورت اسے فسخ کرنے کا حق بھی فریقین کو یکساں طور پر حاصل ہوگا۔

(12) حُسنِ ذوق کا حق:

قرآن، انسان کے انفرادی حسنِ ذوق کا احترام کرتا ہے اور کسی کو اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اسے اس کے اس حق سے محروم کر دے (7:32) حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے سامانِ زیبائش و آرائش سے متمتع ہونا ہر فرد کا حق ہے۔

(13) مذہبی آزادی کا حق:

مذہب کے معاملے میں قرآن ہر انسان کو پوری پوری آزادی دیتا ہے۔ اس کے نزدیک ''ایمان'' نام ہے کسی بات کو عقل و فکر کی رو سے علیٰ وجہ البصیرت ماننے کا۔ لہٰذا، اس میں جور و اکراہ کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ لا اکراہ فی الدین (2:256) اس کا بنیادی اصول ہے۔ اور ہر فرد کو اس کا حق دیتا ہے کہ وہ کفر اور ایمان میں سے جو نسا راستہ جی میں آئے اختیار کرے (18:29)۔ اور جب جی چاہے ایک مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرے۔ لہٰذا۔ مذہب کے معاملہ میں کسی پر کسی قسم کا جبر نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی مملکت کا اتنا ہی فریضہ نہیں کہ مذہب کے معاملہ میں ہر ایک کو آزادی دے، اس کا فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ تمام اہلِ مذاہب کی پرستش گاہوں کی حفاظت کرے (22:40)

اور یہ دیکھے کہ کوئی شخص کسی دوسرے مذہب کی واجب الاحترام ہستیوں کی بے حرمتی نہ کرے (6:109)۔ لیکن اسلام ایک مذہب نہیں بلکہ دین (نظامِ زندگی) ہے جس کے مطابق اسلامی مملکت قائم ہوتی ہے۔ لہٰذا، وہ اس کی تو اجازت دیتا ہے کہ جس کا جی چاہے اس جماعت (امتِ مسلمہ) میں شامل ہو جائے جو اس مملکت کے قیام کی ذمہ دار ہے اور جس کا جی چاہے اس میں شامل نہ ہو (غیر مسلم رہے)۔ لیکن وہ اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ اس مملکت کی حدود میں رہنے والے کوئی دوسرا نظامِ مملکت قائم کر لیں۔ یہ تو ریاست درونِ ریاست (STATE WITHIN A STATE) قائم کرنے کے مرادف ہوگا، جس کی کہیں بھی اجازت نہیں مل سکتی (مملکت کے اندر دوسرا نظام قائم کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ لیکن۔ اگر

کوئی بدنصیب چاہے تو وہ۔ اسلام کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر کے اقلیتوں کے زمرہ میں شامل ہوسکتا ہے)۔ نہ ہی اس کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ جس کا جی چاہے اس مملکت کے قوانین کی پابندی کرے اور جس کا جی چاہے ان سے انحراف کرے۔ قوانینِ مملکت سے انحراف جرم ہوتا ہے اور ان سے سرکشی، بغاوت۔ غیر مسلموں کو ان کے شخصی معاملات میں اپنے مذہب کی پیروی کی اجازت ہوگی، قوانینِ مملکت کے سلسلہ میں نہیں۔

(14) مظلوم کو فریاد کا حق:

قرآن کریم نے کہا ہے کہ ہر مظلوم کو اس کا حق حاصل ہے کہ ظلم کی فریاد کرے (4:148) اس کے اس حق کو کوئی چھین نہیں سکتا۔ اسی طرح وہ اس کا بھی حق دیتا ہے (حق ہی نہیں دیتا بلکہ اس کی تاکید کرتا ہے) کہ ہر شخص حق وانصاف کی شہادت دے، خواہ وہ کسی کے (بلکہ خود اس کے اپنے) خلاف ہی کیوں نہ جائے (4:135)۔

(15) ملزم کا حقِ تکریم:

قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ جب تک کسی کا جرم ثابت نہ ہوجائے، اسے بے گناہ سمجھا جائے۔ نہ اسے کسی قسم کی تکلیف پہنچائی جائے اور نہ ہی اسے معاشرہ میں حقارت کی نظروں سے دیکھا جائے۔ سزا جرم کی ہوگی، الزام کی نہیں (24:12، 24:16)۔

(16) امن واطمینان کی ضمانت:

اسلامی حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ افرادِ معاشرہ کو کسی قسم کا خطرہ لاحق نہ ہو۔ نہ ہی انہیں خواہ مخواہ پریشان ہونا پڑے۔ لاخوف عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (2:38) کی فضا پیدا کرنا اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔

(17) اپنی اپنی ذمہ داری:

لاتزروازرۃ وزر اُخریٰ (6:165)۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، اسلامی مملکت کا بنیادی شعار اور افرادِ مملکت کا بنیادی حق ہے۔ ہر شخص اپنا اپنا فریضہ سرانجام دینے کا آپ ذمہ دار ہوگا۔ کوئی شخص اپنی ذمہ داری کسی دوسرے پر نہیں ڈال سکے گا۔ یہ ہیں مختصر الفاظ میں وہ حقوق جو (مشروط اور غیر مشروط طور پر) اسلامی مملکت کے افراد کو حاصل ہوں گے۔ ان کی ضمانت آئین کی رو سے دی جانی ضروری ہے۔''

(جاری ہے)

رسالہ نہ ملنے کی صورت میں مندرجہ ذیل نمبرز پر رابطہ کریں شکریہ
Cell: 0321-4460787 Phone: 042-35714546

غلام احمد پرویزؒ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دوسری قسط

اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ کا مفہوم کیا ہے

مرض، تشخیص اور علاج

(ایک جامع مقالہ جس سے اسلامی حکومت کا تصور اور نقشہ نکھر کر سامنے آجاتا ہے)

مولانا محمد اسماعیل مرحوم (سابق صدر جمعیت اہل حدیث) اپنے رسالہ ''جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث'' میں لکھتے ہیں۔

تحقیق وتثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآن عزیز کے انکار کا ___ جو احادیث قواعد صحیحہ اور ائمہ سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں ان کا انکار کفر ہوگا اور ملت سے خروج کے مرادف۔

(جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث، ص:48)

بخاری اور مسلم کے مجموعوں کے متعلق آپ ارشاد فرماتے ہیں:

بخاری اور مسلم کی احادیث کی صحت پر امت متفق ہے ___ ان احادیث کی صحت قطعی ہے۔

(ایضاً، ص:55)

بالفاظ دیگر، مولانا اسمٰعیل (مرحوم) کے نزدیک، بخاری اور مسلم کی کسی حدیث کے انکار کا وہی اثر ہے جو قرآن عزیز کے انکار کا ہے۔ ان احادیث کا انکار کفر ہے اور ایسا کرنے والا مسلمانوں کے گروہ سے خارج ہوجاتا ہے۔ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

جبرائیل قرآن اور سنت دونوں کو لے کر نازل ہوتے تھے۔ آنحضرتؐ کو سنت بھی قرآن کی طرح سکھاتے تھے۔ اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل نہیں۔

(ایضاً، ص:60)

جب وحی میں تفریق نہ رہی، اور قرآن اور حدیث میں مذکور وحی ایک ہی قرار پا گئی، تو مولانا مسعود احمد صاحب نے بات کھل کر کہہ دی کہ حدیث کو کتاب اللہ کہا جاتا ہے۔

(تفہیم اسلام، ایڈیشن 1967ء، ص:72، شائع کردہ اہل حدیث اکادمی، لاہور)

لیکن دونوں کتابیں (قرآن اور حدیث) ہم پایہ نہیں حدیث کا مقام قرآن سے بلند ہے امام اوزاعیؒ کا قول ہے قرآن اس سے زیادہ حدیثوں کا محتاج ہے جس قدر حدیثیں قرآن کی محتاج ہیں۔

(مختصر جامع بیان العلم، ص:223)

ایک اور امام حدیث یحییٰ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

حدیث قرآن پر قاضی ہے، قرآن حدیث پر قاضی نہیں۔ (ایضاً)

''قاضی'' کے معنی یہ ہیں کہ اگر قرآن اور حدیث میں تضاد واقعہ ہو۔ (اور ایسا اکثر ہوتا ہے) تو فیصلہ حدیث کا قابل تسلیم ہوگا نہ کہ قرآن کا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ عقیدہ تھا کہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ علامہ حافظ محمد ایوب (مرحوم) اپنے کتابچہ ''فتنہ انکارِ حدیث'' میں لکھتے ہیں۔

> نبیؐ کے قول کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ قرآن کے مطابق ہو تب تو حجت رہے اور مطابق نہ ہو تو حجت نہ رہے ___ جس طرح قرآن کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہماری عقل کے مطابق ہو تو حجت ہو اور ہماری عقل کے مطابق نہ ہو تو حجت نہ ہو اسی طرح نبیؐ کے قول کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ قرآن کے مطابق ہو تو حجت ہو اور قرآن کے مطابق نہ ہو تو حجت نہ ہو۔ (ص:82)

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

> رہی یہ بات کہ قول رسول ﷺ، قرآن کے خلاف ہو تو بھی وہ حجت ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۚ اِلْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ (2:180) ''تمہارے اوپر والدین کے لیے وصیت فرض ہے۔ اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جبکہ اسے موت آئے۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لا وصیتہ للوارث۔'' وارث کے لئے وصیت نہیں ہے۔'' اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اسی حدیث پر رہا ہے یعنی وارث کے لیے وصیت ناجائز قرار دی گئی حدیث نے قرآن کو منسوخ کر دیا اور قول رسول ﷺ، قرآن کی آیت کے خلاف حجت اور موجب عمل رہا۔ (ص:85)

اس کے بعد وہ اس کی علت سمجھاتے ہیں۔

> اب اگر یہ کہا جائے کہ سمجھ نہیں آتا کہ رسول ﷺ کا کوئی قول قرآن کے خلاف ہو اور رسول ﷺ کا قول قرآن کو نسخ کر دے تو پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ رسول ﷺ کا قول اپنا قول نہیں ہوتا وہ درحقیقت خدا کا قول ہوتا ہے جس طرح قرآن خدا کا قول ہے اسی طرح رسول ﷺ کا قول بھی خدا کا قول ہے اور جس طرح قرآن کی ایک آیت دوسری آیت کو منسوخ کر دیتی ہے اسی طرح خدا کا ایک قول (یعنی قول رسول ﷺ) دوسرے قول یعنی قرآن کو منسوخ کر دیتا ہے۔ (ص:86)

جن آیات کو حدیث منسوخ کر دیتی ہے (ان حضرات کے عقیدے کی رو سے) ان کی تلاوت باقی رہتی ہے اور حکم منسوخ ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں آپ اس آیت کو ایک بار پھر سامنے لائیے جس کا ایک حصہ پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ مخالفین نے حضور ﷺ سے کہا کہ اگر آپ ﷺ قرآن میں کچھ تبدیلی کر دیں تو ہم آپ ﷺ سے مفاہمت کر لیں گے اس کے جواب

میں خدا کا ارشاد ہوا۔

قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ (10:15)

اے رسول (ﷺ)! ان سے کہہ دو کہ میں اپنی طرف سے قرآن میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا میرا منصب تو وحی خداوندی کا اتباع کرنا ہے اور بس اگر میں اس کی خلاف ورزی کروں تو میں بھی مواخذہ خداوندی سے بچ نہیں سکتا میں اس مواخذہ سے ہمیشہ ڈرتا ہوں۔

آپ نے غور فرمایا کہ جس رسول ﷺ کا اعلان یہ ہو کیا وہ قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کرنے کا خیال تک بھی دل میں لا سکے گا؟ خود (حدیث کی اہم کتاب) مشکوٰۃ میں یہ روایت موجود ہے کہ:

حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے کہ میرا کلام، کلام اللہ کو منسوخ نہیں کرتا اور کلام اللہ میرے کلام کو منسوخ کر دیتا ہے۔ (مشکوٰۃ، جلد اوّل، کتاب اعتصام الکتاب وسنت)

لیکن اس کے باوجود، ان حضرات کا یہی عقیدہ اور عمل ہے کہ حدیث، قرآن کو منسوخ کرسکتی ہے۔

عام طور پر (عوام کو مطمئن کرنے کے لئے) کہا جاتا ہے کہ حدیث صرف قرآن کے مجمل احکام کی تفسیر اور تشریح بیان کرتی ہے۔ اس کا اتنا ہی فریضہ ہے لیکن مودودی صاحب (مرحوم) کا ارشاد ہے کہ یہ غلط ہے۔

حدیث کے مستقل ماخذ ہونے کی نفی سے اگر مراد یہ ہے کہ اس کی حیثیت صرف شارح اور مفسر کی ہے یعنی وہ انہی مسائل وقائع کی وضاحت کرتی ہے جن کا مجملاً قرآن میں ذکر آ گیا ہے اور خود اس کی اپنی مستقل حیثیت کچھ نہیں ہے تو یہ دعویٰ واقعہ کے خلاف ہے ___ مسائل واحکام کے باب میں حدیث ایک مستقل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ (ترجمان القرآن، جولائی، اگست، ستمبر 1950ء)

شروع شروع میں جب احادیث کو پرکھنے کے معیار مقرر کئے گئے تو ان کے سرفہرست یہ معیار تھا کہ جو حدیث قرآن کے مطابق ہو وہ صحیح ہے۔ جو اس کے خلاف ہو وہ مسترد کر دینے کے قابل۔ لیکن اس سے ایک مشکل پیدا ہوگئی احادیث کی کتابوں میں جہاں ایسی روایات ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف ہیں، وہاں ایسی روایات بھی ہیں جو خود قرآن کے خلاف ہیں۔ لیکن (جیسا کہ مولانا محمد اسماعیل مرحوم نے کہا تھا) بخاری اور مسلم کی تو کسی ایک حدیث کے انکار سے بھی مسلمان دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ ان احادیث کو جو قرآن کے خلاف ہیں، ان کتابوں سے نکال دینے کی جرأت کون کرسکتا ہے؟ اس مشکل کے حل کے لئے کہہ دیا کہ یہ معیار (کہ جو حدیث قرآن کے مطابق ہو وہی صحیح ہے) سرے سے غلط ہے۔ جماعت اہل حدیث کے ترجمان، الاعتصام (لاہور) کی 23 جنوری 1970ء کی اشاعت میں حسب ذیل شذرہ شائع ہوا تھا۔

دسمبر 1965ء کے رسالہ ''فکر ونظر'' راولپنڈی میں لکھا گیا ہے کہ ''حضور ﷺ نے فرمایا:

اذا روی عنی حدیث فاعرضوہ علیٰ کتاب اللہ فان وافقہ فاقبلوہ والا تذروہ(؟) جب کوئی حدیث میری نسبت بیان کی جائے تو اس کا مقابلہ کتاب اللہ سے کرو اگر قرآن کے حکم کے مطابق ہو تو قبول کرو ورنہ اسے چھوڑ دو۔''

''واضح رہے کہ یہ بات جو مقالہ نگار نے لکھی ہے صحیح نہیں واقعہ یہ ہے کہ جس زمانے میں یہ حدیث گھڑ کر رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کی گئی تھی اسی دور میں ماہرین فن حدیث آئمہ کرام نے ببانگ دہل اعلان کر دیا تھا کہ یہ ہرگز ہرگز فرمانِ رسول (ﷺ) نہیں۔

یعنی یہ کہنا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ میری طرف منسوب روایات کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھو جو اس کے مطابق ہو اسے صحیح سمجھو جو اس کے خلاف ہو اسے غلط سمجھو، زندیقوں کا مسلک ہے! اہل تقویٰ کا مسلک یہ ہے کہ جو روایت قرآن کے خلاف ہو اسے صحیح سمجھو! یا للعجب۔۔۔

اور اس تضاد کو اس طرح مٹاؤ کہ قرآن کی آیت کو منسوخ سمجھو۔

آپ نے غور فرمایا کہ ''وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' کا یہ مفہوم ہمیں کھینچ کر کہاں لے آیا؟ یعنی اب دین نام رہ گیا ان روایات کا جو دو سو سال تک زبانی کلامی بیان ہوتی رہیں اور جنہیں پھر جامعین حدیث نے اپنے قیاس کے مطابق تسلیم کیا ان روایات نے کتاب اللہ کی جگہ لے لی!

سنت:

تشکیل پاکستان کے بعد، ان علماء اور جماعتوں نے (بالخصوص) جنہوں نے مطالبہ پاکستان کی آخر دم تک مخالفت کی تھی، تقاضا شروع کر دیا کہ پاکستان کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اس لئے یہاں اسلامی قوانین نافذ کروان سے کہا گیا کہ یہاں مختلف فرقوں کے لوگ بستے ہیں اور علماء میں بھی باہمی اس قدر اختلاف ہے، تو اس صورت میں اس قسم کا ضابطہ قوانین کس طرح مرتب کیا جا سکے گا جسے سب (متفقہ طور پر) اسلامی تسلیم کر لیں کافی ردو کد کے بعد، 1951ء میں، مختلف فرقوں کے نمائندوں پر مشتمل اکتیس علماء کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں یہ ریزولیوشن پاس کیا گیا کہ:

1۔ شخصی قوانین ہر فرقہ کے اپنی اپنی فقہ کے مطابق ہوں اور

2۔ ملکی قوانین (پبلک لاز) کتاب وسنت کے مطابق ہوں۔

یہ ریزولیوشن (یا منشور) پاس کر کے انہوں نے پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ دیکھ لیجئے! تمام علماء اس مطالبہ پر متفق ہو گئے ہیں۔ اگر اب بھی حکومت اسلامی قوانین مرتب اور نافذ نہیں کرتی تو یہ اس کی بدنیتی اور بددیانتی ہوگی حکومت نے پراپیگنڈہ کے اس طوفان سے بچنے کے لئے اسے آئین میں شامل کر دیا۔

اس متفق علیہ مطالبہ کا ذرا تجزیہ کر کے دیکھئے سب سے پہلے یہ پوچھئے کہ اسلامی قوانین کو پرسنل لاء اور پبلک لاز میں تقسیم

کرنے کے لئے اتھارٹی کونسی ہے؟ قرآنِ کریم میں اس قسم کی تفریق وتخصیص کا شائبہ تک نظر نہیں آتا نہ ہی صدرِ اوّل میں اس کا کوئی نشان ملتا ہے۔ یہ خالصتاً عہد ملوکیت کی ایجاد ہے جسے انگریزوں نے بھی یہاں برقرار رکھا تھا۔

دوسرے یہ کہ شخصی قوانین ہر فرقہ کے الگ الگ ہوں گے اس سے اس فرقہ بندی کو آئینی سند حاصل ہوگئی جسے قرآنِ کریم نے بہ نص صریح شرک قرار دیا ہے۔

جس نے حدیث کے بیشتر ذخیرہ کا گہرا مطالعہ کر کے احادیث کو پرکھنے کی نظر بہم پہنچائی ہو کثرت مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہوجاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ ﷺ کا مزاج شناس ہوجاتا ہے___ اس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے___ اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد وہ اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت کو دیکھ لیتی ہے اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس جام زریں میں جو بادہ معنی بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعت اسلام اور مزاج نبوت کے مناسب نظر نہیں آتی۔ (تفہیمات، حصہ اوّل، ص:302 تا ص:324)

لیجئے! اس ''سنت'' کا تعین ہوگیا جس کا اتباع دین ہے۔ یعنی پہلے تو جامعین احادیث (امام بخاریؒ) وغیرہ نے ان لاکھوں روایات میں سے جو انہیں ملیں، اپنے قیاس کے مطابق کچھ روایات الگ کرلیں اور انہیں احادیث رسول اللہ ﷺ قرار دے دیا۔ آگے بڑھے تو، مزاج شناس رسول ﷺ کی نگہ بصیرت نے یہ فیصلہ کر دیا کہ ان احادیث میں سے ''سنت'' کون کون سی ہے۔ اس طرح ''دین'' کا تعین ہوگیا جسے اللہ تعالیٰ نے نوع انسان کے لئے قیامت تک نظامِ حیات قرار دیا تھا۔ مولانا محمد اسماعیل مرحوم نے مودودی مرحوم کے اس مسلک کے متعلق فرمایا تھا۔

اگر ایک جماعت اپنی عقیدت مندی سے کسی ایک بزرگ یا قائد کو خدا کا مزاج شناس سمجھ لے یا رسول ﷺ کا مزاج شناس تصور کر کے پھر اسے اختیار دے دے کہ اصول محدثین کے خلاف جس حدیث کو چاہے قبول کرلے جسے چاہے رد کردے یا کوئی عالم یا قائد بلاوجہ کسی موضوع یا متعلق، مرسل یا منقطع حدیث کے متعلق یہ دعویٰ کردے کہ میں نے اس میں ''ہیرے کی جوت'' دیکھ لی ہے۔ تو یہ مضحکہ انگیز پوزیشن ہمیں یقیناً ناگوار ہے۔ ہم انشاء اللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے اور سنت رسول ﷺ کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ (جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث، ص:63)

اب آیئے ''کتاب وسنت'' کی اس اصطلاح کی طرف جسے ان حضرات نے اسلامی قوانین کی تدوین کے لئے آئین

پاکستان میں شامل کرایا تھا۔ ہم نے اسی زمانہ میں کہہ دیا تھا کہ اس معیار کی رو سے قیامت تک بھی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کرلیں اس لئے کہ ''سنت'' ہر فرقہ کی الگ ہے جس میں وہ کسی قسم کے ردوبدل کو جائز قرار نہیں دیتے۔ ان حضرات کے پاس، اس اعتراض کا جواب، کفر کے فتویٰ کے سوا کیا ہو سکتا تھا! بیس برس تک یہ لوگ اپنے اسی ''جہاد'' میں مصروف رہے لیکن اس کے بعد مودودی مرحوم کو مجبوراً یہ اعلان کرنا پڑا کہ:

کتاب وسنت کی رو سے پبلک لاز کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو شیعہ، اہل حدیث اور حنفیوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پا سکے۔ (ایشیاء، مورخہ 23 اگست 1970ء)

دلچسپ بات یہ ہے کہ مودودی مرحوم نے اِدھر یہ اعلان کیا اور اُدھر اپنی جماعت کے انتخابی منشور میں یہ شق بھی شامل کردی کہ:

جماعت اسلامی کے پیش نظر پاکستان کو ایک ایسی ریاست بنانا ہے جو قرآن وسنت کے اتباع کی پابند ہو۔

بہرحال، جب مودودی مرحوم نے کہا کہ: ''کتاب وسنت'' کی رو سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پا سکے تو ان سے پوچھا گیا کہ پھر پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی کیا شکل ہوگی؟ فرمایا کہ یہاں فقہ حنفی نافذ کردی جائے! یعنی ''کتاب وسنت'' کو تو اس لئے متروک قرار دے دیا کہ تمام فرقے اس پر متفق نہیں ہو سکیں گے اور اس کا علاج یہ بتایا کہ یہاں ایک فرقہ (حنفی) کی فقہ نافذ کردی جائے گویا اس پر سب فرقے متفق ہو جائیں گے!! دوسرے فرقے تو ایک طرف، فقہ کے متعلق خود مودودی مرحوم کے عقائد یہ ہیں کہ:

1۔ اس مسخ شدہ مذہبیت میں بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ (ترجمان القرآن بابت محرم 1360ھ)

2۔ مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال کیوں نہ ہو، زمان ومکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا نہ اس کی نظر تمام ازمنہ واحوال پر وسیع ہو سکتی ہے لہٰذا اس کے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے۔ (تفہیمات، حصہ دوم، ص:426)

3۔ انسان خواہ سراسر اپنی رائے سے اجتہاد کرے یا کسی الہامی کتاب سے اکتساب کر کے اجتہاد کرے، دونوں صورتوں میں اس کا اجتہاد دنیا کے لئے دائمی قانون اور اٹل قاعدہ نہیں بن سکتا کیونکہ انسانی تعقل اور علم ہمیشہ زمانہ کی قیود سے مقید ہوتا ہے۔ (تنقیحات، ص:120)

اس کے برعکس تمام زمانی ومکانی قیود سے آزاد اگر کوئی ہے تو وہ صرف خداوند عالم ہے جس کے پاس علمِ حقیقی ہے، اور جس کے علم میں زمانہ کے تغیرات سے ذرا برابر کوئی تغیّر واقع نہیں ہوتا۔

(تنقیحات، ص:120)

فقہ:

اس مقام پر مختصر الفاظ میں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ فقہ کسے کہتے ہیں اور یہ کیسے وجود میں آئی یہ بتایا جاچکا ہے کہ عہدِ عباسیہ میں، احادیث کو اس لئے جمع اور مرتب کیا گیا کہ ان کے ذریعے اللہ اور رسول کی اطاعت کا فریضہ ادا کیا جاسکے لیکن اس زمانے تک زندگی کے تقاضے اس قدر بڑھ چکے تھے کہ احادیث کی رو سے تمام مسائل کا حل مل نہیں سکتا تھا اور اگر ملتا بھی تھا تو احادیث کے عین مطابق عمل کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اس دشواری کے پیش نظر بعض مقننین نے سوچا کہ اسلام کو بہ ہیئت مجموعی سامنے رکھ کر، اپنے غور و تدبر (تفقہ) کی رو سے ان مسائل کا حل مستنبط کیا جائے ان کے اس طرح وضع کردہ قوانین کو فقہ کہا جاتا ہے اور فقہی احکام کی پیروی کو ''خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت'' قرار دے دیا جاتا ہے۔ جب استنباط مسائل کی یہ طرح پڑی تو فقہی قوانین کے بکثرت مجموعے مرتب ہو گئے ان میں سے چار نے زیادہ شہرت حاصل کی تھی یعنی:

نمبر شمار	نام	پیدائش	وفات
1۔	امام اعظمؒ ابوحنیفہ (کوفی)	80ھ	150ھ
2۔	امام مالکؒ (یمنی)	93ھ	179ھ
3۔	امام شافعیؒ (عسقلانی مکی)	150ھ	204ھ
4۔	امام احمد بن حنبل (بغدادی)	164ھ	241ھ

یہ سنی حضرات کے ائمہ فقہ ہیں شیعہ حضرات کی فقہ جعفری الگ ہے۔ سنیوں میں اہل حدیث کا الگ فرقہ ہے جو کسی فقہ کے قائل نہیں وہ براہ راست حدیث پر عمل کرنے کے قائل ہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ احادیث، جامعین حدیث کے قیاس کی رو سے منتخب ہوئیں اور فقہ، فقہاء کے قیاس کا نتیجہ ہے۔ لیکن ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' کا ذریعہ یہی احادیث یا فقہ ہیں۔ معتقدین حدیث کا عقیدہ ہے کہ حدیث قرآن کی مثل ہے (مثلہ معہ) بلکہ یہ قرآن کو منسوخ بھی کرسکتی ہے اس طرح فقہ حنفیہ کے ایک مسلمہ امام، ابوالحسنؒ عبید اللہ کرخی کا قول ہے کہ:

> ہر وہ حدیث جو اس طریقہ کے خلاف ہو جس پر ہمارے اصحاب (ائمہ فقہ) ہیں، یا تو مسئول ہے یا منسوخ اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو، وہ مؤل ہے یا منسوخ۔
>
> (تاریخ التشریع الاسلامی مؤلفہ علامہ محمد الخضری، اردو ترجمہ شائع کردہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ 421)

ان حضرات کے نزدیک، دین، فقہ میں تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔ اب فقہ میں مزید تحقیق و تفتیش یا اجتہاد کی ضرورت ہے نہ ان احکام میں کسی قسم کا ردوبدل ہوسکتا ہے۔ قرآن کریم نے یہ خصوصیت کلمات اللہ (احکام وقوانین خداوندی) کی بتائی تھی کہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ انسانوں کے وضع کردہ ان

احکام (فقہی قوانین) کو ابد تک غیر متبدل قرار دے کر، انہیں قوانین خداوندی کا ہم پایہ بنا دیا یہ ہمارا قیاس نہیں ان حضرات کا عقیدہ ہے کہ فقہی احکام قرآن کی مثل ہیں۔ فقہ حنفی میں الھدایہ معتبر ترین کتاب ہے۔ اس کی جلد اوّل کے مقدمہ میں کہا گیا ہے کہ ''الھدایہ کالقرآن۔'' (الھدایہ قرآن کی مثل ہے)

(بحوالہ ہفت روزہ ''اہل حدیث''، مورخہ 12 فروری 1982ء)

ان تصریحات کی روشنی میں آپ اس نکتہ پر غور کیجئے جو ہمارا بنیادی موضوع گفتگو ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں (شیعہ فرقہ کو چھوڑ کر) سنیوں کے ہاں احادیث کے چھ مجموعے ہیں جنہیں صحاح ستہ کہا جاتا ہے ان میں جو روایات آ گئی ہیں وہ غیر متبدل ہیں۔ اس کے بعد فقہ کے (کم از کم) چار آئمہ کی طرف منسوب قوانین ایسے ہیں جو غیر متبدل سمجھے جاتے ہیں۔ کیا یہ کسی طرح بھی ممکن ہے کہ ان کے متبعین اپنے اختلافات چھوڑ کر، اُمت واحدہ بن جائیں!

مکاتب فکر:

(ضمناً) ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآنِ کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے اور اختلاف کو خدا نے غضب کا موجب۔ جب ان آیات قرآنی کو بہ تکرار و اصرار سامنے لایا گیا جن میں فرقہ بندی کو شرک قرار دیا گیا ہے تو یہ حضرات بڑی مشکل میں پھنس گئے ان کے پاس اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس سے ذرا سی اُمید بندھتی تھی کہ شاید یہ حضرات اپنی روش پر نظر ثانی کرنے کے لئے مجبور ہو جائیں اور سوچیں کہ اس شرک کو توحید سے کس طرح بدلا جا سکتا ہے۔ لیکن (معلوم نہیں وہ کون تھا جس نے ان کے کان میں یہ افسوں پھونکا کہ) یہ فرقے ہیں ہی نہیں یہ مکاتب فکر ہیں اس خود فریبی یا ابلہ فریبی سے یہ حضرات بہت خوش ہو گئے کہ اب ہم فرقوں کے پابند رہتے ہوئے بھی مشرک قرار نہیں پائیں گے یعنی رام داس کا نام عبدالرحمٰن رکھ دینے سے سمجھ لیا کہ وہ کافر نہیں رہا مسلمان ہو گیا ہے!

ذرا مکاتب فکر اور فرقوں کے فرق پر غور فرمایئے ہمارے ہاں بڑے بڑے مشہور مفکر (فلاسفر) گذرے ہیں (مثلاً) بوعلی سینا، فارابی، رازی، الکندی وغیرہ ___ ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا ''مکتبہ فکر'' (School of Thought) تھا۔ کیا آپ نے کبھی سنا ہے کہ بوعلی سینا کے مکتبہ فکر کے پیرو اپنی نماز الگ پڑھتے تھے اور فارابی کا مکتبہ فکر الگ نماز! کیا آج مسلمانوں کے ممالک میں کہیں کوئی گروہ ایسا ہے جو بوعلی سینا کے طریق پر نماز ادا کرتا ہو، یا فارابی کے طریق پر! ___ ان کے برعکس ذرا فرقوں پر نگاہ ڈالئے بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ___ صلوا کما رایتمونی اصلی

(کتاب الاذان)

نمازوں کا اختلاف:

''یعنی تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو'' ___ اگر یہ روایت نہ بھی ہوتی تو بھی بات واضح تھی

کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے صحابہؓ کے ساتھ ساری عمر نمازیں ادا فرمائیں انہوں نے نہ صرف یہ کہ حضور ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا بلکہ خود بھی اسی طرح نماز پڑھتے رہے۔ اس کے بعد آج تک نہ تو اُمت میں ذرا سا بھی انقطاع (GAP) واقعہ ہوا یعنی یہ حادثہ ایک لمحہ کے لئے بھی رونما نہیں ہوا کہ دنیا میں کہیں بھی مسلمان نہ رہے ہوں۔ نہ ہی کبھی نماز کا فریضہ ترک کیا گیا بالفاظ دیگر لاکھوں مسلمانوں نے حضور ﷺ کے ساتھ، حضور ﷺ جیسی نماز ادا کی اور اس کے بعد اس عمل محسوس کا تسلسل آج تک جاری ہے۔ اس سے عام سمجھ بوجھ کا انسان بھی اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ یہ عمل محسوس آج بھی بعینہ ویسا ہونا چاہئے جیسا رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھا لیکن امر واقعہ کیا ہے؟ یہ کہ مسلمانوں میں متعدد فرقے ہیں اور ہر فرقے کی نماز الگ الگ ہے اور طرفہ تماشا یہ کہ ہر فرقہ کا دعویٰ ہے کہ جو نماز وہ ادا کرتے ہیں وہ بعینہ وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ ادا فرماتے تھے! کیا عقل سلیم اسے باور کرتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی نماز رسول اللہ ﷺ کی نماز کے مطابق ہے؟ یہ فرقے کس طرح ثابت کرتے ہیں کہ ان کی نماز ''جزئیات'' تک رسول اللہ ﷺ کی نماز کے مطابق ہے؟ احادیث کی رو سے فقہ کی رو سے مختلف حدیثیں اور فقہی احکام ہر فرقہ کی نماز کی تائید میں سند بہم پہنچا دیتے ہیں۔ اس کے بعد ان میں بحث اس امر پر چل پڑتی ہے کہ تمہاری حدیث ضعیف ہے اور ہماری صحیح۔

کہہ دیا جاتا ہے کہ (شیعہ حضرات کی نماز سے قطع نظر) سنیوں کے مختلف فرقوں کی نماز میں جو اختلاف ہے وہ فرعی سا ہے اصولی طور پر سب کے ہاں نماز مشترک ہے اور ان فروعی اختلافات کو چنداں اہمیت حاصل نہیں سو اول تو یہی غلط ہے کہ ان فروعی اختلافات کو چنداں اہمیت حاصل نہیں۔ ان فرقوں کے نزدیک انہیں اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ ایک فرقے کے پیروکار کسی دوسرے فرقے والوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھنا تو کجا اگر (مثلاً) نیچی آواز سے آمین کہنے والا اونچی آواز سے آمین کہنے والوں کی مسجد میں نماز پڑھ لے تو وہ، اگر اپنی مسجد کا فرش اکھیڑ نہیں دیں گے تو کم از کم، اسے دس بار دھو کر پاک اور صاف ضرور کریں گے یہ جو آئے دن ''وہابیوں اور بدعتیوں'' یا ''بریلویوں اور دیوبندیوں'' کی مسجدوں میں تنازعے اٹھتے ہیں ___ امام قتل کر دئے جاتے ہیں ___ مقتدیوں میں دنگا فساد ہوتا ہے ___ پولیس مداخلت کرتی ہے ___ مسجد پر تالہ پڑ جاتا ہے اور مقدمہ عدالت میں پہنچ جاتا ہے ___ تو یہ نماز کے فروعی اختلاف کی وجہ ہی سے ہوتا ہے۔ لہٰذا، یہ کہنا کہ ان فروعی اختلافات کو چنداں اہمیت حاصل نہیں، حقیقت کا بطلان اور محض اعتراض سے بچنے کے لئے فرار کی راہ اختیار کرنے کے مرادف ہے۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ جب کسی حکم کو خدا (یا اس کے رسول، کا متعین فرمودہ قرار دیا جائے تو اس کے اصول اور فروع سب اپنی اپنی اہمیت رکھتے ہیں اور ان میں سے کسی میں بھی اختلافات نہیں کیا جا سکتا مثلاً قرآنِ کریم نے وضو کے سلسلے میں کہا ہے۔ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ (5:6) اپنے منہ دھویا کرو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک۔ اب اگر کوئی شخص اپنے ہاتھ پہنچوں تک دھوئے، اور دوسرا کہنیوں تک، تو کیا آپ کہہ دیں گے کہ یہ بھی ٹھیک ہے اور وہ بھی ٹھیک کیونکہ یہ فرق محض فرعی ہے اصولی نہیں؟ ایسا کہنا صریحاً غلط ہوگا ان میں سے ٹھیک ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہی ٹھیک ہو سکتا ہے جس کا

عمل قرآن کے حکم کے مطابق ہو لہٰذا، نماز کی جو جزئیات رسول اللہ ﷺ نے متعین فرمائی تھیں، جب تک ان کی بعینہٖ پابندی نہیں کی جائے گی، نماز رسول اللہ ﷺ کی نماز کے مطابق قرار نہیں پائے گی یہ کہنا کہ کسی نے ہاتھ کانوں تک اٹھالئے یا نیچے رکھے ہاتھ سینے تک باندھ لئے یا زیر ناف آمین بالجہر کرلی یا خفی پاؤں میں اتنا فاصلہ رکھ لیا یا اتنا امام کے پیچھے سورۃ الفاتحہ پڑھی یا نہ پڑھی، یا فلاں دعایوں پڑھ لی یا یوں۔ تراویح آٹھ پڑھ لیں یا بیس، عید کی نماز میں تکبیریں اتنی کہہ لیں یا اتنی نماز فلاں وقت پڑھ لی یا فلاں وقت اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ جزئیات کا فرق ہے محض اعتراض سے بچنے کا بہانہ ہے۔ اگر اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا تو (مثلاً) کسی اہل حدیث سے کہئے کہ وہ حنفیوں کی سی نماز پڑھ کر اعلان کردے کہ اس کی نماز ہوگئی ہے؟ وہ ایسا کبھی نہیں کرے گا۔

آپ نے یہ اعتراض عام طور پر سنا ہوگا کہ اگر ہم احادیث کو نہ مانیں تو بتایئے کہ نماز کس طرح پڑھی جائے گی! اس کا اولین جواب تو تصریحات بالا میں موجود ہے کہ احادیث کی رو سے کونسی نماز کو رسول اللہ ﷺ کی نماز کہا جائے گا؟

اس سلسلہ میں ایک اور اہم سوال سامنے آتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ آیا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ یہ حکم مجمل ہے اور اس اجمال کی تفصیل احادیث میں ملتی ہے۔ اس تفصیل کے مطابق نماز ادا کرنے سے خدا کے حکم کی تعمیل ہوسکتی ہے۔ اس کے بغیر نہیں۔

قرآنِ کریم میں یہ بھی حکم آیا ہے کہ اِعۡدِلُوۡا ۟ (5:8) یعنی عدل کرو یہ حکم بھی اسی طرح مجمل ہے جس طرح اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ کا حکم کیا اِعۡدِلُوۡا ۟ کے اجمالی حکم کی تعمیل کے لئے احادیث رسول اللہ ﷺ میں دی گئی تفاصیل کی ضرورت نہیں؟ یعنی ان تفاصیل کی کہ عدل کی مشینری کس قسم کی ہوگی، اس کا طریق کار (Procedure) کیا ہوگا؟ نماز کی تفاصیل اور جزئیات کے متعلق تو انبار در انبار کتابیں تصنیف کی گئی ہیں اور تصنیف کی جارہی ہیں۔ کیا عدل کی مشینری اس کی جزئیات، اس کے طریق کار کی تفاصیل بھی احادیث کی رو سے اس طرح مرتب کی گئی ہیں؟ اگر نہیں کی گئیں تو کیوں؟ یہ واضح ہے کہ نبی اکرم ﷺ مسجد نبوی ﷺ میں عدل کا فریضہ ادا فرماتے تھے! اطاعت سنت کی رو سے تو آج بھی مساجد ہی میں عدالتیں قائم ہونی چاہئیں۔ کیا علماء کرام میں سے کسی نے آج تک یہ فتویٰ دیا ہے کہ ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کی عمارات میں بیٹھ کر عدل کرنا خلاف سنت رسول اللہ ﷺ لہٰذا ناجائز ہے؟ اگر ایسا نہیں کیا گیا (اور ظاہر ہے نہیں کیا گیا) تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صلوٰۃ کی جزئیات اور نظام عدل کی جزئیات میں یہ فرق کیوں کیا جارہا ہے؟ یا مثلاً قرآن میں ہے کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ (2:183) ''تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں۔'' روزوں کے جزئیاتی احکام بھی احادیث کی رو سے مرتب کئے جاتے ہیں اور ان کی پابندی ضروری۔ ان میں سے کسی ایک جزئیہ کی خلاف ورزی سے بھی روزہ نہیں ہوتا!

اس کے ساتھ ہی قرآنِ کریم میں یہ بھی آیا ہے کہ: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ (2:216) ''تم پر جنگ فرض قرار دیا گیا ہے۔'' کیا قتال (جنگ) کی بھی روزوں جیسی جزئیات مرتب کی گئی ہیں؟

حضور ﷺ کے زمانے میں جنگ تیروں اور تلواروں کے ذریعے لڑی جاتی تھی۔ کیا آج بھی اس سنت رسول اللہ ﷺ کے اتباع میں) جنگ تیروں اور تلواروں سے لڑی جائے گی، اور بندوقوں اور توپوں کے ذریعے جنگ لڑنا خلاف سنت۔ لہٰذا، ناجائز قرار پا جائے گا؟

سوچئے کہ نماز اور روزہ سے متعلق احکام میں سنت رسول اللہ ﷺ کی مطابقت کے بارے میں اس قدر شدت اور عدل اور قتال کے احکام کے سلسلہ میں سنت رسول اللہ ﷺ سے ایسی بے اعتنائی! ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب واضح ہے کہ یہ احکام اس زمانے میں مدون ہوئے تھے جب مذہب اور حکومت میں ثنویت پیدا ہو چکی تھی جس کی رو سے نماز، روزہ مذہب کے دائرے میں آئے تھے اور عدل اور قتال حکومت کے حیطہ اقتدار میں لہٰذا اتباع سنت کی تاکید اور شدت اعتقادات اور عبادات کے باب میں برتی گئی اور نظامِ حکومت کو مملکت کے حوالے کر دیا گیا۔

اسلامی مملکت میں ایسا نہیں ہوگا، اس میں قرآن کے تمام مجمل احکام کی تفصیلات، مملکت متعین کرے گی۔

بات یہاں سے چلی تھی کہ اور تو اور نماز جیسے بنیادی فریضہ میں بھی اس قدر اختلافات صدیوں سے چلے آ رہے ہیں اور ان کی بنیاد احادیث اور فقہ پر ہے۔ اس کے بعد سوچئے کہ کیا آج کوئی ذریعہ ایسا ہے جس سے حتمی اور یقینی طور پر متعین کیا جا سکے کہ رسول اللہ ﷺ کس طریق کی نماز ادا فرمایا کرتے تھے؟ اسی ایک مثال پر دیگر احکام کو قیاس کر لیجئے! اور پھر آپ خود ہی فیصلہ فرما لیجئے کہ ان احکام کی ادائیگی سے کیا یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ہم ''اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ'' کا فریضہ ادا کر رہے ہیں!

یہ تمام خلفشار اور انتشار یہ سب اختلاف و افتراق یہ ساری بے یقینی اور نامحکمی یہ سب اس لئے ہے کہ صدرِ اوّل کے بعد، ملوکیت آ گئی اور ''اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ'' کا قرآنی مفہوم امت کی نگاہوں سے اجھل ہو گیا، اور اس کا مفہوم ہم نے اپنے ذہن سے متعین کر لیا۔ اَطِيْعُوا اللّٰهَ کے متعلق کہہ لیا کہ اس سے مراد کتاب اللہ کی اطاعت ہے۔ اور اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ کا ذریعہ وہ احادیث جنہیں رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیا گیا اور ان پر مبنی فقہی احکام۔ جب تک دین کی اس اساس اور بنیاد کا صحیح مفہوم سامنے نہیں آتا اور اس پر عمل نہیں کیا جاتا، نہ امت میں وحدت پیدا ہو سکتی ہے، نہ دین کا تمکن، اور اسلام کا احیاء ہو سکتا ہے آیئے ہم دیکھیں کہ اس کا قرآنی مفہوم کیا ہے۔

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کا قرآنی مفہوم

مختصر الفاظ میں یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اس سے مفہوم کیا ہے۔ اب ہم اس اجمال کی تفصیل کی طرف آتے ہیں۔ سب سے پہلے اس بنیادی حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ ''اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول'' سے دو الگ الگ اطاعتیں مقصود نہیں۔ (یعنی اللہ کی اطاعت الگ اور رسول کی اطاعت الگ) دین میں اطاعت صرف خدا کی مطلوب ہے۔ رسول اللہ ﷺ خدا کی اطاعت کرتے تھے اور خدا ہی کی اطاعت کراتے تھے۔ حضور کا عظیم ترین مقام و منصب عبدہ (خدا کا محکوم و اطاعت گزار) ہے۔ اس کا علان ہم ساری دنیا کے سامنے یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ:

اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ

اسلام، مذہب نہیں جس میں ہر شخص انفرادی طور پر، خدا کی پرستش، بندگی، پوجا پاٹ، (Worship) کرے تو اطاعت کا فریضہ ادا ہو جاتا ہے۔ یہ دین ہے یعنی نظامِ حیات جس میں خدا کی اطاعت صرف اپنی آزاد مملکت میں ہو سکتی ہے۔ یہ مملکت (یا اس کی حکومت) دنیا میں منفرد تھی۔ یعنی اس میں محکومیت کسی انسان کی نہیں ہوتی تھی۔ صرف خدا کی ہوتی تھی اور خدا نے اس مقصد کے لئے اپنی کتاب نازل کی تھی۔ لہٰذا اس میں اطاعت صرف کتاب اللہ کی تھی۔

لیکن انسانی دنیا میں کتاب اللہ کی حکومت بھی نظام کے تحت ممکن تھی۔ یہ نظام نبی اکرم ﷺ نے قائم فرمایا تھا جس کے اولین سربراہ بھی حضور ﷺ خود تھے۔

اس انداز حکومت اور اطاعت کے لئے قرآنِ کریم نے ایک منفرد اصطلاح مقرر کی یعنی ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' اس سے مراد یہ تھی کہ خدا کی اطاعت لیکن انفرادی طور پر نہیں اس نظام کی رو سے جسے رسول اللہ ﷺ نے قائم فرمایا تھا اور رسول کی بھی اپنی اطاعت نہیں بلکہ رسول ﷺ کی وساطت سے خدا کی اطاعت۔ ایک آئینی نظامِ حکومت میں، حکومت کے ادنیٰ سے عامل کے حکم کی اطاعت اس کی اطاعت نہیں ہوتی اس حاکم اعلیٰ کی اطاعت ہوتی ہے جس کا وہ کارپرداز ہوتا ہے۔ جب چوراہے پر کھڑا سپاہی آپ سے کہتا ہے کہ بائیں طرف چلئے، تو وہ آپ سے اپنا حکم نہیں منواتا حاکم اعلیٰ کا حکم منواتا ہے۔ قرآنی حکومت میں بھی صورت ایسی ہی ہوتی ہے۔ جب وہ کہتا مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ (4:80) تو اس کا مطلب یہی ہے کہ تم جو رسول کے حکم کی اطاعت کرتے ہو تو یہ رسول کی اطاعت نہیں یہ خدا کی اطاعت ہوتی ہے کیونکہ رسول احکام خداوندی کی اطاعت کراتا ہے۔ اپنی نہیں اس کا منصبی فریضہ ہی خدا کی اطاعت کرانا ہے۔ اطاعت کے اسی انداز کو وہ ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے قرآنِ کریم میں اس کے بکثرت شواہد موجود ہیں۔ ان میں سے چند ایک یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

1۔ سورۃ المائدہ کی مشہور آیت ہے:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیۡنَ یُحَارِبُوۡنَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ وَیَسۡعَوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ فَسَادًا اَنۡ یُّقَتَّلُوۡۤا اَوۡ یُصَلَّبُوۡۤا اَوۡ تُقَطَّعَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَاَرۡجُلُہُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ اَوۡ یُنۡفَوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ ؕ ذٰلِکَ لَہُمۡ خِزۡیٌ فِی الدُّنۡیَا وَلَہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ۙ (5:33)

اس آیت کا عام ترجمہ یہ ہے:

بلا شبہ ان لوگوں کی، جو ''اللہ اور اس کے رسول (ﷺ)'' کے ساتھ جنگ کرتے ہیں، اور ملک میں فساد پھیلانے کے لئے دوڑتے پھرتے ہیں، یہ سزا ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے یا سولی چڑھا دیا جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمت سے کاٹ دیئے جائیں یا انہیں جلاوطن کر دیا جائے یہ ان کے لئے اس دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لئے عذاب عظیم ہے۔

اس میں ''اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف جنگ'' کے الفاظ آئے ہیں۔ متقدمین سے لے کر متاخرین تک، سب کے نزدیک اس سے مراد اسلامی حکومت کے خلاف جنگ کرنے کے ہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں امام محی السنۃ بغوی نے معالم التنزیل میں، اور نواب صدیق حسن خان (مرحوم) نے فتح البیان میں لکھا ہے۔

حضرت ابن عباس سعید بن مسیب، مجاہد، عطاء، حسن بصریؒ، ابراہیم نخعی، ضحاک اور ابوثور نے کہا کہ جس نے اسلامی محروسہ (ریاست) میں ہتھیار اٹھایا اور راستوں کو پرخطر کر دیا پھر وہ گرفت میں آیا اور پکڑا گیا اس کے بارے میں مسلمانوں کے امام (سربراہ مملکت) کو اختیار ہے کہ جو چاہے سزا دے۔

امام رازیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

''اگر باغی یا ڈاکو نے قتل بھی کیا ہے اور مال بھی لیا ہے، تو امام کو اختیار ہے کہ تینوں سزاؤں میں سے جو سزا اس کو چاہے دے۔''

ہمارے زمانے میں، سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) اپنی تفسیر، تفہیم القرآن میں اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(فساد فی الارض میں) زمین سے مراد وہ ملک یا علاقہ ہے جس میں امن وانتظام قائم کرنے کی ذمہ داری اسلامی مملکت نے لے رکھی ہو اور ''خدا اور رسول'' سے لڑنے کا مطلب اس نظام صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلامی حکومت نے ملک میں قائم رکھا ہو ___ ایسا نظام جب کسی سرزمین میں قائم ہو جائے تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا، ___ خدا اور رسول کے خلاف جنگ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے تعزیرات ہند میں ہر شخص کو جو ہندوستان کی برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کرے۔ ''بادشاہ کے خلاف لڑائی'' (Waging War -- Against the King) کا مجرم قرار دیا گیا ہے چاہے اس کی کارروائی ملک کے کسی اور دور دراز گوشے میں ایک معمولی سپاہی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور بادشاہ کی دست رس سے کتنا

ہی دور کیوں نہ ہو۔

(تفہیم القرآن، جلد اوّل، ص:465، ایڈیشن 1951ء)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ اس آیت میں ''خدا اور رسول'' سے مراد اسلامی نظامِ حکومت ہے۔ (یہ تقسیم ہند سے پہلے کی تحریر نظر آتی ہے۔)

اس مقام پر ایک اور نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے ہم نے اوپر کہا ہے کہ آئینی حکومت میں صورت یہ ہوتی ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ عامل حکومت جب کوئی حکم دیتا ہے تو اس حکم کی اطاعت اس عامل کی اطاعت نہیں ہوتی، اس حکومت کی اطاعت ہوتی ہے جس کا وہ نمائندہ ہے۔ یہ وجہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا ہے۔ دوسری طرف حکومت کی بھی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اس کے احکام کی اطاعت کرانے میں افسر مجاز جو کچھ کرتا ہے، حکومت اس کا اعلان کرتی ہے کہ وہ اس نے نہیں کیا، خود حکومت نے کیا ہے۔ حکومت اس کی پوری پوری ذمہ داری لیتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کی بھی وضاحت کر دی ہے۔ (مثلاً) جنگِ بدر میں، نبی اکرم ﷺ اور جماعت مجاہدین، مخالفین کو تہِ تیغ کرتے ہیں اور خدا کا ارشاد ہوتا ہے کہ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ (8:17) ''تم نے انہیں قتل نہیں کیا تھا، ہم نے قتل کیا تھا'' اور نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے کہ: وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ (8:17) ''میدانِ جنگ میں تم تیر نہیں چلا رہے تھے، ہم چلا رہے تھے۔'' ان کے ہر اقدام کی ذمہ داری خدا خود اپنے اوپر لیتا تھا۔ یا (مثلاً) صلح حدیبیہ کے موقعہ پر ایک اور نازک وقت آ گیا کہ جماعت مومنین نے، خدا کے ہاتھ اپنی جان و مال بیچ دینے کا جو معاہدہ کر رکھا تھا (9:111) اس کی تجدید کی ضرورت پڑ گئی تھی قاعدہ کے مطابق، صحابہؓ آتے تھے۔ تجدید معاہدہ (بیعت) کے لئے اپنا ہاتھ بڑھاتے تھے اور حضور ﷺ اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ اس بیعت کی توثیق فرما دیتے تھے اس موقعہ پر ارشادِ خداوندی ہوا کہ: اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ (48:10) ''اے رسول (ﷺ)! تمہارے جو رفقاء تجدید معاہدہ کے لئے جو تمہاری بیعت کرتے تھے، وہ تمہاری بیعت نہیں درحقیقت ہماری بیعت تھی۔ ان کے ہاتھ کے اوپر تمہارا ہاتھ نہیں تھا۔ اللہ کا ہاتھ تھا۔'' آئینی حکومت میں ہوتا ہی یہی ہے۔ حکومت کے ساتھ جتنے معاہدات ہوتے ہیں، افسران مجاز ان پر دستخط کرتے ہیں اور حکومت ان کی ذمہ داری لیتی ہے کہ وہ معاہدہ خود حکومت کے ساتھ ہوا ہے مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ (4:80) کا مفہوم یہی ہے۔ حتیٰ کہ وہ حکومت اس کا بھی اعلان کرتی ہے کہ اس معاہدہ کی پابندی موجودہ حکومت پر ہی لازم نہیں اس حکومت کے بعد بھی جو حکومت آئینی طور پر قائم ہوگی (اس حکومت کی جانشین ہوگی) اس پر بھی اس کی پابندی لازمی ہوگی۔

یہ تھا مفہوم حضور ﷺ کے اس ارشاد کا کہ تم پر میرے طریق کی پیروی اور میرے خلفاء (جانشینوں) کے طریق کی پیروی ضروری ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داریاں انسانوں کے

سلسلہ میں اپنے اوپر لے رکھی ہیں، انہیں وہ اس نظام کے ذریعے پوری کراتا ہے۔ براہ راست خود آ کر پورا نہیں کرتا۔ (اس موضوع پر میں اس سے پہلے بڑی تفصیل سے لکھ چکا ہوں)۔

1۔ اب پھر اصل موضوع کی طرف آیئے ہم کہہ رہے تھے کہ ''اللہ اور رسول کے خلاف جنگ'' سے مراد نظامِ حکومت خداوندی کے خلاف جنگ تھی۔ اس سلسلہ میں سورۃ المائدہ کی آیت (5:33) ہمارے سامنے آ چکی ہے۔ دیگر حوالہ جات درج ذیل ہیں۔

2۔ ''خدا اور رسول ﷺ کے خلاف جنگ'' کے متعلق مسجد ضرار کے سلسلہ میں ہے کہ وہ مسجد پناہ گاہ تھی ان لوگوں کے لئے لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (9:107) جنہوں نے خدا اور رسول کے خلاف جنگ کی تھی نیز (9:63) اسی طرح سورۃ البقرہ میں ہے کہ اگر تم لوگ بقایا ربو، چھوڑ دو گے تو فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ (2:279) تو اسے ''اللہ اور رسول ﷺ'' کی طرف سے اعلان جنگ سمجھو۔

3۔ سورۃ الانفال کی پہلی آیت ہے قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ (8:1) ''انفال اللہ اور رسول ﷺ کے لئے ہے۔'' (انفال کے معنی عام طور پر مالِ غنیمت کئے جاتے ہیں۔) یہاں کہا ہے کہ انفال، اللہ اور رسول ﷺ کے لئے ہیں۔

امام ابن جریر طبریؒ اس آیت کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> انفال کے معنی کے متعلق ان تمام اقوال میں سے قرین صواب ان لوگوں کا قول ہے جنہوں نے کہا ہے کہ یہ وہ اضافے ہیں جو امام وقت بعض یا کل فوج کے لئے کرتا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ ان حضرات کے نزدیک ''اللہ اور رسول ﷺ'' سے مراد امام وقت (یعنی اس وقت کی حکومت کا سربراہ) ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) اس آیت کے تحت اپنے تشریحی نوٹ میں لکھتے ہیں کہ:

> مالِ غنیمت جو لڑائی میں ہاتھ آئے وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ہے۔ یعنی یہ بات نہیں ہونی چاہئے کہ جو جس کے ہاتھ پڑ گیا وہ اسی کا ہو گیا بلکہ سب کچھ امام کے سامنے پیش کرنا چاہئے وہ اسے جماعت میں تقسیم کرے گا۔
>
> (ترجمان القرآن، جلد دوم، ص:53)

اسی طرح مالِ غنیمت کے خمس کے متعلق ہے کہ وہ ''اللہ اور رسول ﷺ ___ کے لئے ہے۔

4۔ سورۃ الحشر میں ان یہودیوں کے متعلق جنہوں نے اسلامی مملکت کے خلاف سرکشی اختیار کی تھی، فرمایا کہ: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ (59:4) ''جو لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو اذیت پہنچاتے ہیں ___'' اگر یہاں اللہ سے مراد ''اللہ تعالیٰ'' لئے جائیں تو بات بن ہی نہیں سکتی (اس لئے کہ خدا کو) اذیت کون پہنچا سکتا ہے اس سے مراد اسلامی نظام کے لئے اذیت اور پریشانی کا موجب بننا ہے۔

5۔ اب آگے بڑھئے فتح مکہ کے بعد اسلامی مملکت نے فیصلہ کیا کہ مشرکین کو کعبہ میں آنے سے روک دیا جائے اس کے

لئے 9ھ حج اکبر کے اجتماع میں اعلان کیا گیا جس کے الفاظ یہ تھے:

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (9:1) ۔۔۔ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ۭ (9:3)

جن مشرکین کے ساتھ تم نے صلح کا معاہدہ کیا تھا (لیکن انہوں نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کی) ان کے لئے اس حج اکبر کے اجتماع میں، اعلان کر دو کہ خدا اور رسول ﷺ نے اس معاہدے کو کالعدم قرار دے دیا اور اس کے بعد وہ اس باب میں بری الذمہ ہیں۔

ظاہر ہے کہ معاہدات کئے بھی حکومت کی طرف سے جاتے ہیں اور انہیں کالعدم بھی حکومت ہی کی طرف سے قرار دیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ''اللہ اور رسول ﷺ'' کا مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

6۔ قرآنِ کریم میں ایسی آیات بھی آئی ہیں جن میں ''اللہ اور رسول ﷺ'' کے الفاظ آتے ہیں لیکن ان کے لئے صیغہ واحد کا استعمال ہوا ہے۔ حالانکہ عربی زبان کے قاعدے کی رو سے، ان کے لئے تثنیہ کا صیغہ آنا چاہئے تھا۔ اس سے بھی واضح ہے کہ ''اللہ اور رسول ﷺ'' سے دو الگ الگ اطاعتیں مراد نہیں بلکہ ایک ہی مراد ہے۔ یعنی نظامِ حکومت کی اطاعت (مثلاً)

ا۔ سورہ انفال میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۝ (8:20)

اے جماعت مومنین! تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور اس سے (عنہ ___ واحد کا صیغہ ہے) روگردانی نہ کرو درآنحالیکہ تم اس حکم کو سن رہے ہو (اس کی تشریح ذرا آگے چل کر کی جائے گی۔)

ب۔ اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ (8:24)

اے جماعت مومنین! تم ''اللہ اور رسول ﷺ'' کی دعوت پر لبیک کہو جبکہ وہ (صیغہ واحد) تمہیں اس امر کی طرف بلا رہا ہے جو تمہیں زندگی عطا کر دے گا۔ (نیز 3:171)

ج۔ سورۃ النور میں ہے:

وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ۝ (24:48-49)

اور جب (ان منافقین کو) اللہ اور رسول ﷺ کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ (صیغہ واحد) ان کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک فریق پہلو تہی کر لیتا ہے اور اگر ان کا کوئی حق کسی پر واجب ہو تو

پھر یہ اس کی طرف (صیغہ واحد) سر جھکائے ہوئے چلے آتے ہیں۔

د۔ اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر ہے:

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ۭ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ۭ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝۵۴ (24:54)

اے رسول ﷺ! ان سے کہہ دو کہ وہ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کریں ازاں بعد اگر یہ اس اطاعت سے روگردانی کرنے لگ جائیں تو یہ سمجھ رکھیں کہ اس پر (صیغہ واحد) صرف اس کی اپنی ذمہ داری ہے اور وہ تبلیغ احکامِ خداوندی ہے اور ان پر ان کی ذمہ داری اگر انہوں نے اس کی (صیغہ واحد) اطاعت کر لی تو صحیح راستے پر لگ جائیں گے۔

ان آیات میں دیکھئے! ''اللہ اور رسول ﷺ'' کے الفاظ آئے ہیں لیکن صیغے اور ضمائر واحد کے استعمال کئے گئے ہیں۔ یہ اس حقیقت کی بین دلیل ہے کہ اس اصطلاح سے مفہوم ___ اسلامی نظامِ حکومت ہے۔

7۔ آیت (8:20) میں کہا گیا ہے ''اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۝۲۰'' ''تم اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول ﷺ کی ___ اور اس سے روگردانی نہ کرو جبکہ تم سن رہے ہو۔''

سمع وطاعت:

وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۝۲۰ (تم سن رہے ہو) اس میں ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ کتاب تو صامت (خاموش) الفاظ کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس کی آواز سنائی نہیں دیتی اس کے لئے ایک زندہ اتھارٹی کی ضرورت ہوتی ہے جس کا حکم سنا جائے قرآنِ کریم میں اطاعت کے لئے سماعت (سننے) کی شرط متعدد مقامات میں آئی ہے۔ سورۃ البقرہ میں ہے وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (2:285) مومنین کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کہتے ہیں ___ ''ہم نے اس حکم کو سن لیا ہے اور ہم اس کی اطاعت کریں گے۔ سورۃ المائدہ میں ہے اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (5:7) جب تم نے کہا تھا کہ ہم نے سن لیا ہے اور ہم اس کی اطاعت کریں گے۔ سورہ توبہ میں ہے کہ مومنین کا شیوہ ہے کہ: (24:51) ''جب انہیں اللہ اور رسول ﷺ کی طرف بلایا جاتا ہے کہ وہ (صیغہ واحد) ان کے اختلافی معاملات کا فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سن لیا ہے اور ہم اس کی اطاعت کریں گے۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے۔ دین میں خالی کتاب کی اطاعت ممکن نہیں اس کے لئے زندہ اتھارٹی کا ہونا ضروری ہے۔ جو حسب موقعہ اور ضرورت، کتاب کے احکام کا آرڈر دے اور جماعت اس آرڈر کی تعمیل کرے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے جو نظام قائم کیا تھا اس میں حضور ﷺ خود وہ پہلی زندہ اتھارٹی تھے جن کے آرڈرز کو سنا جاتا تھا اور ان کی اطاعت کی جاتی تھی یہی وہ نظام تھا جسے حضور ﷺ کے بعد بھی بدستور آگے چلنا تھا۔ جب تک وہ نظام قائم رہا، کتاب اللہ کی اطاعت، ایک زندہ اتھارٹی کی وساطت سے ہوتی رہی جب وہ نظام درہم برہم ہو گیا تو (قرآنی حکومت کے آرڈر دینے والی) زندہ اتھارٹی

باقی نہ رہی۔ دین مذہب میں تبدیل ہوگیا اور اطاعت کے لئے مجرد کتابوں کو کافی سمجھ لیا گیا اس کا نتیجہ وہ اختلاف وافتراق ہے جس کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے۔ زندہ اتھارٹی وہ مرکز ہوتی ہے جس کے ساتھ وابستگی سے اُمت کی وحدت قائم رہتی ہے وہ نہ رہے تو وحدت اُمت کی کوئی صورت ہو نہیں سکتی۔ آخر میں ہم ایک ایسی آیت سامنے لاتے ہیں جس کے بعد یہ سمجھنے اور سمجھانے کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں رہتی کہ قرآن کی رو سے، ''اللہ اور رسول ﷺ'' سے مراد، قرآنی نظامِ حکومت ہے۔ یہ نظام ابتداءً مدینہ میں قائم ہوا تھا۔ مسلمان دیگر مقامات (بالخصوص مکہ) میں بھی تھے۔ انہیں حکم دیا گیا تھا۔ (بلکہ اسے ایمان کی شرط قرار دیا گیا تھا کہ وہ ہجرت کر کے مدینہ آجائیں دیکھئے اس کے لئے الفاظ کونسے استعمال کئے گئے تھے۔ فرمایا:

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (4:100)

جو شخص خدا کی راہ میں ہجرت کرے گا اسے دوسرے مقام میں بہت سی پناہ گاہیں، اور کشائش کی راہیں مل جائیں گی جو شخص، اللہ اور رسول ﷺ، کی طرف جانے کے ارادے سے گھر سے نکلے، اگر وہ اپنی منزل مقصود تک نہ بھی پہنچ پائے اور اسے راستے ہی میں موت آجائے تو خدا کے ہاں سے اسے بھی پورا پورا اجر مل جائے گا۔ نظامِ خداوندی میں حفاظت اور رحمت کے پورے پورے سامان موجود ہوتے ہیں۔

غور فرمایئے یہاں حکم تھا اسلامی نظام کی طرف ہجرت کرنے کا اور اس کے لئے ''اللہ اور رسول ﷺ'' کی طرف جانے کے الفاظ آئے ہیں اگر خالی، رسول ﷺ، کا لفظ ہوتا تو پھر بھی کہا جاسکتا تھا کہ اس سے مراد وہ مقام (مدینہ) ہے جہاں حضور ﷺ اقامت پذیر ہیں۔ لیکن یہاں رسول ﷺ کے ساتھ، اللہ کا لفظ بھی آیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص مقام میں اقامت پذیر نہیں ہوتا کہ اس مقام کی طرف جانے کو ہجرت قرار دیا جائے۔ لامحالہ، اللہ اور رسول ﷺ، سے مراد ہی اس مقام کی طرف ہجرت ہے جہاں اسلامی نظام قائم ہوگیا تھا۔

اس ضمن میں ایک نکتہ اور بھی قابلِ غور ہے۔ مکہ کے مسلمانوں کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا یہ حکم اس زمانے میں ملا تھا جب نظامِ خداوندی مدینہ میں قائم ہوا تھا اور مکہ میں غیر خداوندی نظام رائج تھا۔ بعد میں جبکہ مکہ فتح ہوا اور وہاں بھی قرآنی نظام رائج ہوگیا تو پھر وہاں کے مسلمانوں کو ''اللہ اور رسول ﷺ'' کی طرف ہجرت کرنے کے لئے نہیں کہا گیا یہ اس لئے کہ اس کے بعد ''اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت'' مکہ میں بھی ہوسکتی تھی۔ اس طرح جب قرآنی مملکت دور دراز کے علاقوں میں بھی پھیل گئی اور وہاں بھی اسلامی نظام قائم ہوگیا تو نہ صرف یہ کہ وہاں کے مسلمانوں سے نہیں کہا گیا کہ وہ ''اللہ اور رسول ﷺ'' کی طرف ہجرت کریں، بلکہ خود مدینہ کے مسلمان ان علاقوں میں جاجا کر بس گئے یہ اس لئے کہ اب وہاں بھی ''اللہ اور رسول ﷺ'' (نظامِ حکومت خداوندی) موجود تھا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے ''اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول'' کا مفہوم کیا ہے اسلام کے صدرِ اوّل

(عہدِ رسالت وخلافتِ راشدہ) میں اس کا یہی مفہوم لیا جاتا تھا۔ بعد میں جب خلافت، ملوکیت میں بدل گئی تو نظامِ حکومت خداوندی بھی باقی نہ رہا، اور اس کے ساتھ ہی قرآنِ کریم کی مختلف اصطلاحات کا مفہوم بھی بدل گیا۔ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ میں اللہ کی اطاعت الگ اور رسول کی ﷺ اطاعت الگ تصور کر لی گئی اور رسول ﷺ کی اطاعت کے لئے روایات کے مجموعے مرتب کرنے کی ضرورت لاحق ہوگئی۔ اگر اُمت کی قسمت یاوری کرتی تو سوچا جاتا کہ وہ کونسی کڑی گم ہوگئی ہے جس کی وجہ سے دین کا سارا نقشہ بدل گیا ہے لیکن ایسا نہ ہوسکا اور اُمت دین کی جگہ مذہب پر مطمئن ہوکر بیٹھ گئی اس کے بعد آج تک یہی کیفیت چلی آرہی ہے۔ اگر غلط کانٹا مڑنے سے گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑے تو ابتداً (غلط اور صحیح پٹڑیوں میں) چند انچوں کا فرق ہوتا ہے لیکن جوں جوں گاڑی آگے بڑھتی جائے، وہ منزل سے دور تر ہوتی جاتی ہے اور جس قدر تیز رفتار سے وہ چلے، منزل سے اس کا بعد اسی نسبت سے زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ اس ہزار برس میں، اُمت کی گاڑی کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ جتنی کوششیں ''اسلام'' کے فروغ کے لئے کی جاتی ہیں، ان سے مذہب کی گرہیں اور مضبوط ہوتی چلی جاتی ہیں اور چونکہ مذہب پیشہ (Profession) بن چکا ہے اس لئے اس سے وابستہ مفاد پرستیاں ان گرھوں کو اور بھی زور سے کستی رہتی ہیں۔

اندریں حالات، دین کا احیاء ان سعادت مند افراد کے ذریعے ہی ممکن ہوگا جو دین کے قرآنی تصور کو اچھی طرح سمجھ کر، اسے عملی پیکر میں متشکل کرنے کی جرأت اپنے اندر رکھتے ہوں لیکن اس کے لئے دین کے تصور کا سمجھ لینا ہی کافی نہیں ہوگا اس کے ساتھ، اپنی سیرت وکردار کو حضور نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے قالب میں ڈھالنا بھی ضروری ہوگا۔ یہ شرط جذباتی نہیں، خود خدا کی عائد کردہ ہے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (33:21) ''یہ حقیقت ہے کہ رسول ﷺ کی زندگی تمہارے لئے بہترین (بلکہ حسین ترین) ماڈل ہے۔'' (اگرچہ یہ آیت (جنگ احزاب کے موقعہ پر) ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے جہاں حضور ﷺ نے بے حد نازک مقام پر انتہائی شجاعت اور استقامت کا ثبوت دیا تھا، لیکن میرے نزدیک اس کا اطلاق حضور ﷺ کی پوری کی پوری سیرت پر ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ جس بلندی کردار اور پاکیزگی سیرت کی مظہر تھی، وہ اُمت (ہی نہیں تمام عام انسانیت) کے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔ اس کی پیروی اتباع سنت رسول اللہ ﷺ کہلائے گی۔) اس ماڈل کے بنیادی خط وخال بھی اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کے اندر محفوظ کر دیئے ہیں۔ میں نے حضور ﷺ کی سیرت طیبہ قرآنی آئینہ کے مطابق مرتب کی ہے (جو معراجِ انسانیت کے نام سے، قریب پانچ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔) اس میں سیرتِ نبوی ﷺ کے بنیادی عنوانات قرآن سے لے کر احادیث اور تاریخ سے وہ واقعات لئے گئے ہیں جو اس قرآنی عنوان کی تائید کرتے ہیں۔ اس سیرتِ طیبہ کو بطورِ ماڈل سامنے رکھنے سے مومن کے اندر وہ صفات منعکس ہونے لگ جاتی ہیں۔ یہ ہے مراد اسوۂ حسنہ کی پیروی سے۔

اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ احکام کی اطاعت اور اسوہ کی پیروی میں بنیادی فرق ہے۔ احکام کی اطاعت تو اسی نظام کی رو سے ہوگی جس کی تشریح سابقہ صفحات میں کی گئی ہے۔ اسوہ رسول اللہ ﷺ کے معنی ہوں گے اپنے اندر ان صفات کا پیدا کرنا جن کی حسین وجمیل مظہر حضور رسالتمآب ﷺ کی ذات اقدس تھی۔ ان صفات کے حاملین کی جماعت ہی اس قابل

ہوگی کہ وہ نظامِ خداوندی کو از سرِ نو قائم کر سکے۔ خدا کے وعدہ کے مطابق، قائم تو اسے بہر حال ہونا ہے۔ دیکھیں یہ سعادت کس خطہ زمین اور کن طالع مند افراد کے حصے میں آتی ہے۔ یہ اسی سرزمین میں قائم ہو سکے گی جس میں مذہبی پیشوائیت کا عمل دخل نہ ہو۔ اس نظامِ خداوندی کی اطاعت بمنزلہ ''اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت'' کے ہوگی۔

اس نظام میں اطاعت، قرآنِ کریم کے قوانین و اصول و اقدار کی ہوگی ان قوانین کے نفاذ کے طور طریق اور ان اصول و اقدار کی جزئیات، اُمت کے مشورہ سے، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق متعین کی جائیں گی۔ ایسا کرنے میں، روایات اور فقہ میں جو کچھ قرآن کے خلاف نہیں ہوگا اس سے بطور نظائر مدد لی جائے گی۔ ان کی حیثیت غیر متبدل، ابدی قوانین کی نہیں ہوگی اللہ تعالیٰ نے لاتبدیل، (غیر متبدل) صرف کلمات اللہ کو قرار دیا ہے۔ خود خلافت راشدہ کے زمانے میں، حضور ﷺ کے عہد کے کئی ایک احکام میں تبدیلیاں بھی کی گئیں اور نئے احکام کا اضافہ بھی۔ (تفصیل اس کی میری کتاب ''شاہکارِ رسالت'' میں ملے گی۔) ایسا ہی ہر نظامِ خداوندی میں ہوگا جو امور (قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے) اُمت کے باہمی مشورہ سے طے ہوں گے، ان میں کسی بعد کی حکومت میں تو ایک طرف، خود اسی حکومت کے دوران، بہ تقاضائے حالات، ردوبدل اور حک و اضافہ کا امکان ہوگا۔ اس طرح جو قوانین و احکام، قرآنی حکومت کی طرف سے نافذ ہوں گی اسلامی یا شرعی قوانین کہلائیں گے۔ حکومت کے سوا کسی کو اس کا حق حاصل نہیں ہوگا کہ کسی بات کو اسلامی یا غیر اسلامی قرار دے دے۔

ماحصل:

1۔ اطاعت صرف خدا کی جائز ہے اور کسی کی نہیں۔

2۔ خدا کی اطاعت کا عملی طریق اس کی کتاب کی اطاعت ہے۔

3۔ یہ اطاعت اپنے طور پر نہیں ہوگی اسلامی حکومت کے ذریعے ہو سکے گی۔

4۔ اسلامی حکومت وہ ہے جو قرآنی طریق سے وجود میں آئے اور اس کا اعلان کرے کہ اس کا فریضہ قرآنی احکام، قوانین، اقدار اور اصولوں کا نافذ کرنا ہے۔ یہ کچھ اُمت کے مشورہ سے ہوگا۔

5۔ اسلامی حکومت میں نہ کوئی کسی کا محتاج ہوگا نہ محکوم۔ تمام افراد معاشرہ کے رزق کی ذمہ داری مملکت کے سر ہوگی اور اطاعت صرف کتاب اللہ کی ہوگی۔

6۔ اس میں پیدائش کے اعتبار سے انسان اور انسان میں کوئی تمیز نہیں ہوگی سب افراد یکساں واجب التکریم ہوں گے اور حقوق و فرائض کے اعتبار سے عورتوں اور مردوں میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔

7۔ اس میں نہ نظام سرمایہ داری باقی رہے گا نہ تھیا کریسی (مذہبی پیشوائیت)۔

8۔ یہ ان افراد کے ہاتھوں وجود میں آئے گی جن کی سیرت، اسوہ نبی اکرم ﷺ کے قالب میں ڈھلی ہوگی۔ اس سے یہ سرزمین خدا کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔

(ماہنامہ طلوع اسلام، مئی جون 1982)

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شہری و انسانی حقوق

انسانی زندگی کے تصورات میں ایک تصور تو دین انسانی کا واضح کردہ ہے اس تصور کے نزدیک انسان اولین جرثومہ حیات سے ترقی کرتا ہوا اس موجودہ صورت تک پہنچ گیا ہے۔ یہ تمام تبدیلیاں مادہ میں ہی ہوتی رہیں اور ان تبدیلیوں میں لاکھوں سال کا عرصہ گزر گیا۔ انسان کا جسم طبعی قوانین کے ماتحت زندگی بسر کرتا ہے۔ جب اس کا جسم بوسیدہ ہو کر کام کرنے کے قابل نہیں رہتا، تو اس کی یہ زندگی ختم ہو جاتی ہے اور انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ مادی تصورِ حیات ہے۔ اس میں زندگی حیوانیت کی سطح تک رہتی ہے۔ اس تصور کے مطابق زندگی انسانیت کی سطح پر نہیں پہنچتی۔

دوسرا تصورِ حیات یہ ہے کہ جب زندگی انسانیت کی سطح پر آتی ہے تو اس کو جسم کے ساتھ ایک اور توانائی بھی ملتی ہے۔ اس کے لیے قرآنِ کریم نے ''نفخ روح'' (32:9، 15:29، 38:22) کی اصطلاح استعمال کی ہے اور اس کو انسانی ذات یا انسان کا نفس کیا جاتا ہے۔ اس توانائی کی وجہ سے انسان صاحبِ ارادہ و اختیار ہو جاتا ہے اور اس کو علم کے ذرائع حاصل ہو جاتے ہیں (16:78) اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے جو یہ توانائی انسان کو عطا کرتا ہے تو اس عطیہ کی وجہ سے انسان کو صفاتِ خداوندی کی Potential بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ اور انسان ان صفاتِ خداوندی کا بالقوۃ حامل ہو جاتا ہے۔ انسان میں سماعت، بصارت، ربوبیت، جباریت، سلامتی، حکمت وغیرہ صلاحیتیں آجاتی ہیں۔ ان بالقوۃ صلاحیتوں کو بالفصل کرنا، ان صفات کو اپنے اندر پیدا کرنا ہر انسان کا فرض اور مقصدِ حیات قرار دیا گیا ہے۔ جس قدر بھی انسان ان صلاحیتوں کو اپنے اندر بیدار کرے گا۔ اسی قدر قربِ خداوندی اسے حاصل ہوتا ہے۔ ذات کی نشوونما مستقل اقدار پر عمل کرنے سے ہوتی ہے اگر کوئی شخص مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے تو اس کی نفس میں یہ صلاحیتیں از خود بیدار ہوتی جاتی ہیں اور اس کا نفس اس درجہ مستحکم ہو جاتا ہے کہ وہ موت کے بعد بھی اگلی منازل طے کرتا چلتا ہے۔ اگر کوئی شخص ان اقدار کے خلاف زندگی بسر کرتا ہے تو اس کا نفس مضمحل ہو جاتا ہے۔ یہ نفس موت کے بعد زندہ تو رہے گا، لیکن یہ ارتقاء کی مزید منازل طے کرنے کے قابل نہیں ہو سکے گا۔

اس انسانی ذات کے تسلیم کرنے پر اسلامی مملکت کا انحصار ہوتا ہے۔ جب انسان اپنی ذات کا یقین نہیں رکھتا تو اس کو مستقل اقدار کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔ مستقل اقدار تو ہوتی ہی ہیں ذات کو بلند مراتب حاصل ہونے کے لیے اگر کوئی شخص اس ذات پر یقین نہیں رکھتا تو اس کو اقدار کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

انسان کے ہر عمل کا اثر اس کے نفس پر پڑتا ہے (4:11) جن اعمال سے اس نفس میں پختگی آتی ہے وہ اعمال خیر کہلاتے ہیں اور جن اعمال سے اس نفس میں اضمحلال پیدا ہوتا ہے۔ وہ اعمال شر کہلاتے ہیں۔ خیر و شر کا معیار اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔ مغربی علماء و دانشور چونکہ نفس انسانی کے قائل نہیں ہیں اس لئے وہ آج تک خیر و شر کا تعین نہیں کر سکے اور نہ ہی آئندہ کبھی کر سکیں گے۔ اس دنیا میں چونکہ جسم کے ذریعے ہی اعمال خیر و شر وجود میں آتے ہیں، اس لیے جسم ہی وہ ذریعہ ہے جس سے انسانی ذات اپنی صلاحیتوں کی نمود کرتی ہے۔ اسلامی ریاست کی بنیاد بھی یہی نفس انسانی ہوتی ہے۔ چوری کرنا، مال حرام کھانا، کسی کو قتل کرنا، قوانین و احکاماتِ خداوندی سے عدول کرنے سے ذات پر بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں اس لئے اسلامی ریاست کے باشندے یہ جرائم نہیں کرتے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست میں جرائم بہت کم ہو جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف دوسروں پر ایثار کرنا، دوسروں کی پرورش کرنا، دوسروں کی خدمت کرنا اور ان کو نفع پہنچانا، اور قوانین خداوندی کی اطاعت کرنے سے نفس پر اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اسلامی ریاست کے باشندے ان اعمال کو اپنی نفس کی بالیدگی کی وجہ سے کرتے ہیں، تو اس کا نتیجہ by product یہ ہوتا ہے کہ اسلامی مملکت ایک کامیاب مملکت ہوتی ہے۔

اس وضاحت کے بعد آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ سیکولر ریاستیں چونکہ ذات یا نفس اور مستقل اقدار کی قائل نہیں ہوتیں، اس لئے وہ انسانیت کے معیار تک نہیں آتیں۔ یہ حقوق عقلِ انسانی نے خود تجویز کئے ہیں۔ چونکہ حقوق تجویز کرنے والی عقل انسانی کے سامنے نفس کا تصور ہی نہیں ہے اس لئے یہ سارے حقوق شہری حقوق ہیں اور صرف جسم انسانی کو سامنے رکھ کر تو واضح کئے گئے ہیں۔ ان کا ذاتِ انسانی یا انسانیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ذات کی نشوونما اور جسم کی نگہداشت کے تقاضے ایک دوسرے سے متضاد ہوتے ہیں۔ یہ صرف قرآنی نظام ہی وہ نظام ہے جس میں ان دونوں کی پرورش کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ موجودہ دور کے انسانی حقوق ریاست کا inherent in built حصہ نہیں ہیں۔ یہ تو جب شعورِ انسانی نے ترقی کی اور سترہویں صدی عیسوی میں انسانوں کو اپنے حقوق کا احساس ہوا، تو انہوں نے اپنی ریاستوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے عوام کو یہ حقوق دیں۔ اس میں بھی اگر حکومت کمزور ہوتی تھی تو وہ اپنی رعایا کو یہ حقوق دیدیتے تھے لیکن اگر حکومت مضبوط ہے اور رعایا کمزور ہے تو وہ یہ حقوق بھی نہیں دیتی۔ اب ہم ان جسمانی اور شہری حقوق کا ذکر کرتے ہیں جو عقلِ انسانی نے واضح کئے اور جو ریاست دیتی ہے ان حقوق کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی تحریر کرتے چلیں گے کہ چودہ سو سال پیشتر قرآنِ کریم نے بھی یہ حقوق عنایت کئے تھے۔ عالمی ادارہ U.N.O نے انسان کو 32 حقوق دیئے ہیں۔ ان میں سے زیادہ نمایاں حقوق کا ذکر ہم کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ یہ تحریر کریں گے کہ قرآن نے بھی یہ حقوق انسان کو دیئے تھے۔ اب آپ U.N.O کے حقوق کی فہرست قرآنی حقوق کے ساتھ ملاحظہ کریں، اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے چلیں کہ یہ حق قرآن نے بھی دیا تھا (1) تمام انسان آزاد پیدا ہوتے ہیں، اور بنیادی حقوق کے یکساں حقدار ہیں، قرآن اس حق کو تسلیم کرتا ہے۔ ارشادِ عالی ہے وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۝ (17:70) ہم نے بنی آدم کو

عزت بخشی اور خشکی اور دریا میں اُنہیں سواریاں عطا کیں، طرح طرح کے پاکیزہ رزق نے اُنہیں روزی دی اور اُنہیں اپنی مخلوق پر فضلیت دی۔ چونکہ ہر انسان نفس یا ذات کا حامل ہوتا ہے اس لئے ہر انسانی بچہ بغیر کسی تمیز رنگ و نسل، خون، خاندان صرف انسان ہونے کی وجہ سے واجب التکریم ہے۔ احترام آدمیت مستقل قدر اور ابدی اصول ہے۔ خشکی و تری میں جتنی بھی فطرت کی قوتیں ہیں وہ انسان کے تابع ہیں۔ اسے بہترین رزق دیا جا رہا ہے۔ ہماری مخلوق میں سے کثیر ایسی ہیں جس پر انسان کو فضیلت دی۔ ہم خدا کی مخلوق کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ یہ مخلوق کرۂ ارض تک محدود نہیں ہے۔ لیکن انسان کو اکثریت پر فضیلت ہے۔

(2) زندگی، آزادی اور حفاظتِ جان کا حق۔

قرآنِ کریم کے مطابق جان کی حفاظت کا حق مشروط ہے اس سے کہ جن جرائم کی سزا قتل ہے ان میں جان لی جا سکتی ہے۔ اسے بالحق کہتے ہیں۔ (6:152، 2:178)۔

(3) مال کی حفاظت قرآن کی رو سے یہ ہے کہ جو کچھ قانون کی رُو سے کسی کی تحویل میں ہے اسے کوئی دوسرا چھین نہیں سکتا اور نہ ہی اسے ناحق کھا سکتا ہے۔ (4:29، 2:188)

(4) سکونت کی حفاظت، قرآنِ کریم لوگوں کو ان کے گھروں سے نکالنا جائز نہیں سمجھتا۔ (2:85)

(5) شادی کا انتخاب یہ حق بھی قرآن نے دیا ہے (4:19، 4:3)

(6) مذہبی آزادی قرآنِ کریم اس آزادی کا بھی علمبردار ہے (18:29، 106:125، 10:99، 9:6، 2:256)

(7) جب تک کوئی بھی جرم ثابت نہ ہو جائے، اس وقت تک اُسے بے گناہ سمجھنا چاہئے U.N.O کے حق کے مطابق قرآن کا بھی یہی موقف ہے (16-24:12)

(8) غلامی کی لعنت قرآن بھی غلامی کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ (47:4)

(9) بے رحمی کے سلوک سے حفاظت کا حق یہ جو امن کا حق ہے۔ قرآن بھی یہ حق دیتا ہے۔ (85: 10، 33:38، 2:195)

(10) اپنے ملک میں حکومت میں شرکت کا حق یہ یو، این، او کا حق ہے۔ قرآن کریم بھی اس حق کو تسلیم کرتا ہے (22:41)

(11) غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کا تحفظ۔ یہ U.N.O کا حق ہے یہ حق قرآن نے بھی عطا کیا ہے (22:40)

(12) امن کی حفاظت قرآن نے بھی یہ حق دیا ہے (2:38)

(13) مظلوم کو فریاد کا حق قرآن نے بھی یہ حق دیا ہے (4:148)

(14) ہر شخص صرف اپنے عمل کا ذمہ دار ہے۔ کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ یہ U.N.O کا دیا ہوا حق ہے۔ قرآن نے اس کی تصدیق (6:165) میں کی ہے۔

(15) قانون کے نفاذ سے پہلے کا جرم جرم نہیں ہوتا۔ قرآن نے اس کو تسلیم کیا ہے (4:22، 2:275)

(16) حیثیت عرفی کا تحفظ U.N.O کے اس حق کو قرآن نے (49:11-12، 4:148) میں تسلیم کیا ہے۔

(17) ہر ایک سے عدل کیا جائے گا U.N.O۔ قرآن کا تو یہ ایک بنیادی حق ہے (16:90) حتیٰ کہ دشمن سے بھی (4:135)

(18) کسی کی محنت غصب نہیں کی جائے گی۔ قرآن نے اسے بھی تسلیم کیا ہے (53:39،39:70)

(19) جنسی مساوات قرآن نے اس کا حوالہ (33:35،3:194) میں دیا ہے۔

(20) ہم نے کمپیوٹر کی مدد سے U.N.O کے یہ کچھ حقوق حاصل کئے ان کے علاوہ بھی چند اور حقوق ہیں جو اتنے اہم نہیں ہیں۔

اب آپ قرآن کی رُو سے وہ حقوق ملاحظہ فرمائیں جو انسانی ذات کے حقوق ہیں اور ابدی و دائمی ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

(1) خدا رب العالمین ہے۔ اس لئے انسانی ذات کی اوّلین خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق دوسروں کی ربوبیت کرے۔ اور ہر انسان کا حق ہے کہ وہ بلا مزد و معاوضہ ربوبیت حاصل کرے۔

(2) انسان کی حکومت انسان پر حرام ہے۔ کوئی شخص کسی کا حاکم نہیں ہوسکتا۔ حکومت صرف اللہ تعالیٰ کو زیب دیتی ہے (3:79) سیکولر حکومتوں میں عوام کا یہ حق غصب ہوتا ہے۔

3۔ وحدت انسانیت، انسانوں کا فرض ہے کہ وہ انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے نہ کریں۔ ہر انسان کا حق ہے کہ وہ عالمگیر برادری قائم کرے، خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (4:1) ہم نے تم سب کو ایک نفسِ واحدہ سے پیدا کیا لیکن اس دور میں انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کیا ہوا ہے۔ artificial لکیریں کھینچ کر وطن بناتے ہیں اور پھر انسانیت کو اقوام میں تقسیم کر دیتے ہیں جو انسانیت کی تباہی کا باعث ہوتا ہے۔

4۔ عزت و تکریم کا معیار انسان کے ذاتی جوہر ہیں نہ کہ اضافی (49:13)، ہر شخص کا حق ہے کہ اس کو اس کی صلاحیتوں کے مطابق درجہ دیا جائے۔ اضافی نسبتیں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ لیکن اس دور میں ذاتی جوہر کی کوئی عزت نہیں اضافی نسبتیں ہی کام آرہی ہیں۔ Royal Families اس کی واضح مثال ہیں۔ سیاسی پارٹیز میں بھی یہی حال ہے کہ حکومت کئی پشت تک ایک خاندان میں چلی آتی ہے۔

5۔ قانون کی خلاف ورزی جرم ہوتی ہے۔ ان جرائم کے انسداد کے لئے مجرم کو سزا دینا ضروری ہوتا ہے۔ اس کو قصاص کہتے ہیں۔ قصاص کے ملنے سے مجرم کا اس طرح تعاقب کرنا کہ وہ سزا سے نہ بچ سکے۔ قرآنِ کریم نے قصاص میں زندگی کا راز پوشیدہ بتایا ہے۔ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (2:179) ترجمہ: اے صاحبان عقل وبصیرت تمہارے لئے قصاص میں زندگی کا راز مضمر ہے تاکہ تم قانون کی اچھی طرح نگہداشت کرسکو۔ یہ قصاص انفرادی عمل نہیں ہے بلکہ اس میں مملکت Involve ہوتی ہے۔ قتل کے جرم کے بارے میں ارشاد ہے وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا

لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۝ (17:33) جو بے گناہ قتل کر دیا جائے، تو اس کے وارث کو اختیار دیا گیا ہے لیکن وہ قتل میں زیادتی نہ کرے اس لئے کہ اُسے مدد دی گئی ہے۔ قانونِ خداوندی کی اطاعت اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ؕ (7:3) جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے اس کا اتباع کرو۔ اس کے علاوہ کسی سرپرست کا اتباع نہ کرو۔ یہ ہر نفس انسانی کا حق ہے۔ اس حق سے کسی کو نہیں روکا جا سکتا۔ لیکن انسانوں کا یہ حق سیکولر حکومتوں میں ادا نہیں ہو سکتا۔ یہ حق صرف اسلامی مملکت میں ادا ہو سکتا ہے۔

6۔ دوسروں کی پرورش کرنے سے خود انسان کی ذات کی پرورش ہوتی ہے اَلَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝ (92:18) جو دوسروں پر اپنا مال خرچ کرتا ہے تو اس سے اس کی اپنی ذات کی پرورش ہوتی ہے وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ؕ (35:18) ترجمہ: جو دوسروں کی پرورش کرتا ہے اس سے اس کی اپنی پرورش ہوتی ہے۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ اُسے یہ موقع دیا جائے کہ وہ دوسروں کی پرورش کرے تاکہ اس سے اس کی اپنی پرورش ہو۔

7۔ فلاح و بہبود کے کاموں کو تمام انسانیت کے لئے کھلا رکھنا چاہئے۔ اس کو ملکوں، قوموں، گروہوں، پارٹیوں، فرقوں میں تقسیم نہیں کرنا چاہئے بلکہ ہر کام ساری انسانیت کے لئے ہونے چاہئیں۔ جو لوگ پاکستان میں Cancer یا گردوں کی Transplant کے ہسپتال کھول رہے ہیں اور اس سے انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں ان کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ یہ خدمت صرف پاکستان میں محدود کر دیں۔ اگر ان کے ذرائع ان کو اجازت دیں تو وہ یہ ہسپتال بھارت، برما، سری لنکا، نیپال جیسے ملکوں میں بھی کھول سکتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے فرمایا: وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ (13:17) زمین پر دوام صرف ایسی چیز کو حاصل ہوگا، جو تمام نوع انسانی کے لئے نفع بخش ہو، اس سے اپنی ذات کی نشوونما ہوتی ہے اور دوسروں کی بھی ہوتی ہے۔ ہر شخص کا یہ حق ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے لئے نفع بخش کام کر سکیں۔

8۔ انسانی ذات کا تقاضہ ہے کہ حلال مال کھائے اور حرام مال سے اجتناب کرے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے ربوٰ حرام ہے (2:285) اس لئے ایک مسلمان ربوٰ نہیں کھا سکتا۔ اس کے کھانے سے اس کا نفس مضمحل ہوتا ہے۔ سیکولر ریاستوں میں تو سارا نظام ہی سودی ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی سارا نظام سودی ہے ہماری حکومت انٹرنیشنل مالی اداروں سے جو قرض لیتی رہتی ہے وہ سب کاروبار سودی ہوتا ہے۔ آپ جو قمیص پہنے ہوئے ہیں، جو گھڑی پہنے ہوئے ہیں۔ جو کوٹ آپ نے پہن رکھا ہے یہ تمام چیزیں ان فیکٹریوں میں بنی ہیں جو سود لے کر کام کر رہی ہیں۔ اس طرح آپ کا سر سے پاؤں تک کا لباس سودی نظام کا تیار کردہ ہے۔ یہ لباس پہن کر ہم نماز بھی مسجد میں ادا کرتے ہیں۔ حالانکہ سود اللہ و رسول ﷺ کے خلاف جنگ ہے یہ حق ہر نفس کا ہے کہ وہ سود سے اجتناب کرے، اس کا جسم سے کوئی تعلق نہیں، لیکن یہ حق آج ساری دنیا میں ایک نفس کو بھی حاصل نہیں ہے۔

9۔ حفاظت عصمت قرآنِ کریم کے نزدیک عصمت کی حفاظت بھی ایک قدر ہے۔ عصمت کی حفاظت سے مراد یہ ہے کہ

مردوں اور عورتوں کا جنسی تعلق صرف نکاح کے ذریعہ ہی ہوسکتا ہے۔ اس ایک طریقہ کے علاوہ جتنے بھی طریقے ہیں وہ سب بالکل حرام ہیں۔ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝ (17:32) اور زنا کے قریب بھی نہ جاؤ یہ بے حیائی کا کام ہے اور نہایت بُرا کام ہے۔ جو شخص بھی اس فعل کا ارتکاب کرتا ہے اسے سزا دی جائے اور سزا میں نرمی نہ برتی جائے (24:3) اور عورتوں کی رضامندی کے بغیر نکاح جائز نہیں ہے لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ (4:19) یہ تمہارے لئے حلال نہیں ہے کہ تم زیر دستی عورتوں کے وارث بن جاؤ جس شخص کی شادی نہیں ہوسکتی اسے چاہئے کہ وہ اپنے پر کنٹرول رکھے وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ (24:33)، قرآنِ کریم کی یہ ہدایت اس لئے ہے کہ انسان کی ذات پر بُرے اثرات مرتب نہ ہوں۔ یہ صرف ذات کا حق ہے۔ سیکولر حکومتوں میں جو ہم جنس پرستی تک بھی جائز ہے اور وہاں تو Free-Sex سوسائٹی ہوتی ہے یہ وہ حق ہے جس کا صرف انسانیت سے تعلق ہے۔ یو این او جیسے ادارہ تو یہ سوچ تک نہیں سکتے۔

10۔ سورۃ توبہ میں ارشاد ہے قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اِ۟قْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (9:24) تم کہہ دو کہ تمہارے باپ دادا اور تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے کنبے والے اور وہ مال جو تم نے کما کر رکھ چھوڑے ہیں اور وہ تجارت کہ جس کے مندا پڑ جانے کا تمہیں اندیشہ ہے اور وہ مکانات جنہیں تم پسند کرتے ہو تمہیں خدا اور اس کے رسول (نظامِ خداوندی) اور اس کی راہ میں جدوجہد سے، زیادہ عزیز ہوگی، تو پھر (اس روش کے نتائج کا) انتظار کرو، تاآنکہ قانونِ خداوندی کی رو سے، اس کے ظہور نتائج کا وقت آجائے یاد رکھو خدا کبھی اس کو سعادت اور کامیابی کی راہ نہیں دکھاتا جو صحیح راستہ چھوڑ کر اِدھر اُدھر نکل جائے۔

یہ وہ مقام ہے جہاں دنیاوی (جسمانی) مفاد کو دینی (ذات سے متعلق) مفاد پر ایثار کر دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اسی سے تو انسان کی ذات میں پختگی ہوا کرتی ہے۔ یہ حق بھی صرف ذات کا تقاضہ ہے جو سیکولر ریاست میں نہیں ہوتا اور قرآن کریم نے اس باب میں یہ بہترین مثال پیش کی ہے، اور سارے مسئلہ کو صرف ایک آیت میں سمو دیا ہے۔

11۔ سیکولر ریاستوں میں مال و دولت کی فراوانی، یا اپنی ذہانت اور مکر و فریب سے دوسروں کا مال چھیننا بُرا نہیں سمجھتے۔ لیکن نفس کا حق یہ ہے کہ نہ صرف ذرائع رزق اور ذرائع پیداوار کو ذاتی ملکیت نہیں بنایا جاسکتا بلکہ یہ بھی حکم ہے کہ جو دولت تمہارے پاس ضرورت سے زیادہ ہے اس کو نوعِ انسانی کے لئے کھلا رکھا جائے۔ اس سے ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (2:219) ترجمہ: تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی کمائی میں سے کس قدر دوسروں کی ضرورت کے لئے کھلا رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر بھی تمہاری ضرورت سے زائد ہو۔ وہ سب کا سب ضرورت مندوں کو دے دو۔

12۔اس وقت ساری دنیا میں حکومتوں کی فلاح اور ترقی میں تجارت کا بہت اہم کردار ہوتا ہے۔ ہمارے برصغیر میں تو انگریزوں نے ابتداء ہی تجارت سے کی تھی اور آہستہ آہستہ سارے برصغیر کو اپنے تحت لے آئے تھے۔انگریزی حکومت کے دوران انڈیا میں سالانہ بجٹ نہیں ہوتا تھا وہ حاکم تھے جس طرح ان کی پالیسی ہوتی تھی وہ اس پر عمل کرتے تھے۔ان کا تجارت کا طریقہ یہ تھا کہ ہندوستان سے خام مال، جیسے چمڑا، lute وغیرہ انگلستان بھیج دیتے تھے۔وہاں سے Finished products ہندوستان لے جاتے تھے اور وہ س تجارت میں کروڑوں روپے کماتے تھے۔سیکولر ریاستوں میں تجارت پر کوئی اخلاقی پابندیاں نہیں ہوتیں، تاجر کی اپنی صوابدید ہوتی ہے کہ وہ جس قدر پسند کرتا ہے اس پر منافع لے سکتا ہے۔لیکن قرآنِ کریم کی رُو سے ذات کا یہ تقاضہ ہے کہ اِلَّآ اَنۡ تَکُوۡنَ تِجَارَۃً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡکُمۡ (4:29) ترجمہ: لیکن ہاں تم لوگوں کی باہمی رضامندی سے تجارت ہو۔ ہمارے موجودہ دور میں یہ دستور ہے کہ کسی چیز کی کمی (Artificial shortage) کرکے، گاہک کو مجبور کردیا جاتا ہے کہ وہ مہنگی چیزوں کو بھی خریدے لیکن قرآن کے نزدیک یہ ایک جرم ہے۔اس کے نزدیک بیع وشری، بائع اور مشتری کی باہمی رضامندی سے ہونی چاہئے۔

اقوامِ عالم نے جو حقوق انسانیت مقرر کئے ہیں ان میں سے زیادہ اہم حقوق کی ہم نے نشاندہی کردی ہے۔جیسا کہ ہم نے ساتھ ساتھ آیات قرآنی کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ یہ تقریباً سارے حقوق قرآنِ کریم نے بھی آج سے چودہ سو سال پیشتر انسانیت کو عطا کردیئے تھے۔ جو کسی حال میں بھی معطل نہیں ہوسکتے۔لیکن U.N.O کے چارٹر میں یہ درج ہے یہ حقوق معطل بھی ہوسکتے ہیں اور ان حقوق کو صرف ان حدود میں استعمال کیا جائے گا جو مختلف ریاستیں از روئے قانون ان پر عائد کردیں اور چونکہ ہر ریاست کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ جو بھی پابندی لگانا چاہیں وہ حالات کے تقاضوں کے مطابق ان حقوق پر پابندی عائد کرسکتے ہیں۔اس صورت میں آپ خود اندازہ کرسکتے ہیں کہ ان حقوق کی عملاً کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔

قرآنِ کریم کے نزدیک تو حاکم ومحکوم کا تصور ہی باطل ہے کسی انسان کے کسی دوسرے انسان کا محکوم ہونا ہی شرف انسانیت کے خلاف ہے قرآنِ کریم ایک ایسی ہیئت اجتماعیہ قائم کرتا ہے جس میں ساری اُمت اس نظام کو چلانے میں شریک ہوتی ہے (44:55)۔ اس میں اطاعت قوانینِ خداوندی کی ہوتی ہے یہ ہیئت اجتماعیہ ایک ایجنسی ہوتی ہے جو قوانین خداوندی کو جاری کرتی ہے اس کے سامنے سب برابر ہوتے ہیں۔اس میں احکام جاری کرنے والے بھی محکوم ہوتے ہیں۔ وہ احکامات جاری کرنے والے بھی اس ایجنسی کے ماتحت ہوتے ہیں انہیں قانون سازی کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ یہ خود قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں پھر دوسروں سے ان قوانین کی اطاعت کراتے ہیں۔اسلامی نظام تو قائم ہی اس لئے ہوتا ہے کہ وہ حقوق انسانی کو ہر شخص کے لئے مہیا کرے (22:41) قرآنِ کریم نے ان کو معروف کے لفظ سے موسوم کیا ہے۔ اسلامی نظام کے قیام کا جواز ہی یہ ہے کہ وہ معروف کا حکم دیتا ہے اور منکرات سے روکتا ہے اسلامی نظام کے معروف مستقل اقدار، صفاتِ خداوندی، اور حقوقِ انسانی ایک ہی چیز ہوتے ہیں۔ ساری اہمیت ہی ان حقوق کی ہے۔ ان حقوق پر تو کسی

صورت میں بھی پابندیاں عائد نہیں کی جاسکتیں۔ احترام انسانیت فراہمی رزق، عزت نفس، ربوبیت، عدل، احسان، وحدت انسانیت شادی میں انتخاب کا حق، حق محنت، عصمت وعفت کی حفاظت یہ وہ حقوق ہیں جو کبھی معطل نہیں ہو سکتے۔ اسلامی نظام کے شہریوں کا اسلامی نظام سے ایک وعدہ ہوتا ہے۔ یہ معاہدہ اللہ اور بندہ کے درمیان ہوتا ہے۔ چونکہ اس معاہدہ میں اللہ تو خود سامنے نہیں آتا، اس لئے اللہ تعالیٰ کی ساری ذمہ داریاں وہ نظام پوری کرتا ہے۔ اس معاہدہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مومنین کی جان اور مال خرید لیتا ہے اور اس کے بدلے میں اُنہیں اس زمین پر جنت فراہم کرتا ہے۔ (9:111) اسلامی معاشرہ ہی جنت ارضی ہوتا ہے (48:5،39:74)، یہ معاہدہ چونکہ بندے اور خدا کے درمیان ہوتا ہے اس لئے اس نظام کے چلانے والے اللہ کے وعدے پورے کرتے ہیں۔ جو حقوق انسانی کی شکل میں ہوتے ہیں۔ اس لئے ان حقوق کو کسی طور پر بھی معطل نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان میں سے کسی حق کے معطل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنا وعدہ پورا نہیں ہوا اور یہ ناممکن بات ہے۔

تفسیر سورہ آلِ عمران شائع ہوگئی ہے

محترم پرویز صاحب کے دروس پر مشتمل سورہ آلِ عمران کی تفسیر بسلسلہ مطالب القرآن فی دروس الفرقان دو جلدوں میں شائع ہوگئی ہے۔ بڑے سائز کے تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل یہ دونوں جلدیں مبلغ ایک ہزار روپے میں ادارہ طلوع اسلام سے دستیاب ہیں۔

سانحہ ارتحال

بزمِ طلوع اسلام بورے والا کے سابق نمائندہ اور تحریک طلوع اسلام کے قدیمی ساتھی محترم اسلم صابر حرکتِ قلب بند ہوجانے سے وفات پاگئے ہیں۔ مرحوم ایک متحرک شخصیت کے حامل تھے اور فکرِ قرآنی کی توسیع واشاعت کے لئے آخر وقت تک فعال رہے۔ ان کی اچانک وفات سے جو خلاء پیدا ہوا ہے اسے پورا کرنا مشکل ہوگا۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت عطا کرے اور اہلِ خاندان اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل سے نوازے۔ ادارہ مرحوم کے اہلِ خانہ اور احباب کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بابُ المراسلات

میرا مقالہ ''بعنوان قرآنی تعلیمات کے مطابق مرد عورت سے افضل اور نہ ہی عورت مرد سے کمتر ہے'' ستمبر سے دسمبر کے طلوع اسلام کے شمارے میں چار اقساط میں شائع ہوا ہے۔ اِسے بُہت سراہا گیا اور اب قارئین کی خواہش کی تکمیل میں اسے کتابچہ کی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اِس مقالہ پر ادارہ سے وابستہ دو مُعزز اصحاب کی طرف سے، جن میں ہم سب کے اُستادِ گرامی بھی شامل ہیں، عورت کو مار پیٹ کے عنوان کے متعلق دو خطوط میں وضاحت مانگی گئی ہے۔ لہٰذا اُن کے مختصر اہم نکات بیان کرتے ہوئے اپنی سمجھ کے متعلق وضاحت کی جا رہی ہے۔

ایک خط میں ہمارے اُستادِ گرامی مُحترم شیخ اللہ دِتہ ایڈووکیٹ نے بھی میرے مقالہ پر اسی نُکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''ڈاکٹر انعام الحق صاحب کے مضمون کے کچھ حصے معمولی وضاحت طلب ہیں لیکن انہیں وجہ تبصرہ نہیں بنایا جا سکتا۔ ان کا مضمون عالمی سطح پر پذیرائی حاصل کرے گا۔

جیسا کہ آپ کے پہلے بھی علم میں ہے مَیں عورت کی بدنی سزا کے خلاف ہوں اور اضربوھن کا ترجمہ درست خیال نہیں کرتا۔ (اِس ضِمن میں اُن کے موقف سے اختِلاف تو کیا جا سکتا ہے، لیکن اُسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا) بدنی سزائیں مرد وعورت کے لئے دوسرے جرائم میں ہیں جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے بھی مردوں کی سزا بدنی (4:16) کا حوالہ دیا ہے کہ۔

وَالَّذٰنِ یَاۡتِیٰنِہَا مِنۡکُمۡ فَاٰذُوۡہُمَا ۚ فَاِنۡ تَابَا وَاَصۡلَحَا فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡہُمَا ؕ (4:16)

اور اگر دو مرد اِس قسم کی بے حیائی کے مُرتکب ہوں تو انہیں مناسب بدنی سزا دو۔ لیکن اگر وہ اپنے کئے پر نادم ہو کر اِس سے باز آ جائیں اور اپنی اصلاح کر لیں، تو اُن سے درگذر کرو۔ (جبکہ عورت کے لئے فحاشی کے ضِمن میں بھی بدنی سزا مقرر کی گئی ہے۔)

اِسی طرح سوال پیدا ہوتا ہے کہ نُشُوۡزَہُنَّ میں بدنی سزا صرف عورت کے لئے کیوں؟ مرد کے نُشُوۡزًا اَوۡ اِعۡرَاضًا (4:128) میں مرد کو بدنی سزا تجویز نہیں ہوئی۔ وہاں صرف صلح کے لئے کہا گیا ہے یا عدم صلح میں ''جدائی'' تجویز ہے۔''

اسی تناظر میں چوہدری محمد لطیف صاحب سے بھی خط و کتابت ہوئی جن کے متعلقہ نکات درج کئے جا رہے ہیں۔

''پہلی بات یہ کہ میری نظر میں سورۃ النساء کی آیت چونتیس کا تعلق مرد عورت سے نہیں بلکہ میاں بیوی سے ہے اور دوسری یہ کہ ہنستے بستے گھر کو اجڑنے اور بچوں کو تباہی سے بچانے کے لیے جہاں تمام حربے ناکام ہو جائیں وہاں مارنے کی بغرض اصلاح اجازت دی گئی ہے۔ اسے فرض قرار نہیں دیا گیا۔

کسی دوسرے فرد کو مارنا بظاہر ناروا ہے۔ لیکن مارنے کی بھی کئی اقسام ہیں۔ مارا ایذا رسانی کے لئے بھی جاتا ہے اور اصلاح کے لئے بھی۔ ضرورت پڑے تو استاد اپنے شاگردوں کو اور مائیں اپنے بچوں کو بغرض اصلاح پھینٹی لگاتی ہیں۔ اسی طرح جب دھلائی کے سارے طریقے ناکام ہو جاتے ہیں تو داغ دھبے دور کرنے کے لئے دھوبی کپڑوں کو پھینٹی لگاتا ہے۔ مارنا اسے بھی کہتے ہیں لیکن اس پر نہ مار کھانے والے کی تذلیل ہوتی ہے نہ کسی دوسرے کو اعتراض ہوتا ہے۔

گھر میں بیوی اگر سرکشی اختیار کرتی ہے (جس کے امکانات کا خالقِ کائنات کو علم تھا) تو اصلاح احوال کے لئے پہلے پند و نصائح، پھر ہمبستری سے اجتناب اور آخر میں ضرروی سمجھا گیا کہ اگر تھوڑی بہت پھینٹی لگانے سے گھر بچ سکتا ہو تو اسے بھی آزما لیا جائے کیونکہ اس کے بعد ہمیشہ کی جدائی اور عمر بھر کے پچھتاوے کے سوا کوئی چارا باقی نہیں رہتا طلاق کی راہ میں جہاں اللہ تعالیٰ نے بہت سی پابندیاں لگائی ہیں وہاں اس سے بچنے کے لئے ممکنہ علاج بھی تجویز فرمائے ہیں جن میں بغرض اصلاح (نہ کہ بطور سزا) تھوڑی بہت پھینٹی لگانا آخری علاج ہے۔ عربی مَیں جانتا نہیں اور اردو یا انگریزی میں پھینٹی سے بہتر لفظ میرے علم میں ہے نہیں۔ یہی لفظ ماؤں سے سنتے آئے ہیں باز آجاؤ ورنہ ایسی پھینٹی لگاؤں گی کہ تمہیں نانی یاد آجائیگی۔

میرے محترم استاد ڈاکٹر انعام الحق صاحب مارنے کو ناجائز نہیں سمجھتے مگر یہ حق وہ خاوند کی بجائے حاکمِ وقت یا عدالت کو دیتے ہیں۔ لگتا ہے گھر کو تباہی سے بچانے کے لیے خاوند اصلاحِ احوال کے لیے بیوی کو ایک آدھ چپت رسید کر دے تو یہ ان کے نزدیک بیوی کی تذلیل ہے لیکن حکومت کا جلاد تارا مسیح اس کے ننگے بدن پر کوڑے برسائے تو اس سے نہ خاوند بیوی کے مابین محبت و مودت مجروح ہوگی نہ ہی طلاق کی نوبت آئیگی۔''

اِس خط کا میری طرف سے جواب دیا گیا کہ:

میرے پیارے بھائی جانتے ہیں کہ قانون میں امتیاز رکھنے کی روش ایک مہذب معاشرہ میں روا رکھنا تو کُجا یہ تو سوچ میں بھی نہیں لائی جاتی۔ لہٰذا اگر بیوی کی نام نہاد اصلاح کے لئے پھینٹی شوہر لگا سکتا ہے تو یہی اختیار شوہر کی اصلاح کے لئے بیوی کو بِلا امتیاز خود بخود منتقل ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں لگتا ہے کہ ہمارے معاشرہ میں شوہروں کو پٹنے کے علاوہ دیگر فرائض ادا کرنے کی فُرصت ہی نہیں مِلا کرے گی۔ اسلامی حکومت کی اطاعت دونوں مرد و زن پر ماتھے پر بغیر شکن لائے اور بِلا تردد دِل کی کامل رضامندی سے کرنا مومنین کا بنیادی فریضہ ہے، اسے ننگے بدن بیوی کی زناکاری کی مترادف پٹائی کی سزا اور وہ بھی تارا مسیح کے ہاتھوں سے تشبیہ دینا جائز نہ ہوگا۔

ایسی سزا کا تصور قرآنی ذہن میں تو چوہدری صاحب پیدا ہی نہیں ہونے دینا چاہیے۔ میرے خیال میں نکاح کے معنی ہی معاہدہ ہوتا ہے جس میں دو پارٹنرز بمعنی زوج بغیر کسی اکراہ کے اور دِل کی پوری رضامندی سے داخل ہوتے ہیں تاکہ اپنے نئے گھر کو جنت کا نمونہ بنا سکیں۔''

اس خط کے جواب میں چوہدری صاحب نے اُستادِ گرامی کے نُکتہ کی وضاحت کی کہ:

’’آپ نے فرمایا منطق کی رو سے کسی کجروی کی جو سزا بیوی کے لئے ہے وہی سزا خاوند کے لئے بھی ہوگی۔ آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہتے ہونگے میں تو منطق نہیں جانتا مگر قرآنِ کریم میں ہم دیکھتے ہیں کہ سورہ النساء کی آیت 34 میں عورت کے لئے نُشُوْزَ کی سزا مختلف ہے اور آیت 128 میں خاوند کے اسی جرم کی سزا کچھ اور ہے۔‘‘

قبل اس کے کہ ہم ایک ہی عمل کی سزا میں مرد کے لئے نرم اور عورت کیلئے سخت سزا کا جائزہ لیں، محترم اللہ دِتہ صاحب ایڈووکیٹ نے نُشُوْزَ کے معانی بھی اپنے خط میں یوں درج کئے ہیں کہ

1۔ میاں بیوی میں سے ایک کا مخالفت پر اتر آنا۔

2۔ نافرمانی کرنے لگنا۔

3۔ جھگڑنا۔

4۔ بدسلوکی کرنا۔

5۔ ایک دوسرے کے خلاف یا سامنے کھڑے ہوجانا۔

6۔ متنفر ہوجانا اور

7۔ بلند ہونے اور بڑا ہونے کا اظہار کرنا۔

اِن سبھی معانی کی رو سے انسان کا اپنے فرائضِ منصبی کے خلاف ہونے کے معنی کی دلالت ہوتی ہے۔ اِسی لئے راغب نے کسی چیز کا اپنی جگہ (فرائضِ منصبی) سے ہٹ جانا بتائے ہیں۔

یہاں پہلے پانچ معانی میں یہ اضافی اور مخصوص معانی میں زیرِ بحث شوہر اور بیوی کے تعلقات کے موضوع میں استعمال ہوتا ہے۔

اِس کے برعکس منطقی طور پر دیکھا جائے تو نُشُوْزَ کے اِن درجِ بالا سات معانی میں چھٹا اور ساتواں معانی مخصوص اور اضافی پوزیشن میں صِرف شوہر اور بیوی کے تعلقات پر شامل نہیں، بلکہ یہ مُطلق اور سبھی مرد و زن پر وارد ہونے کا تاثر دیتے ہیں اور اِن سے کسی شوہر اور بیوی وغیرہ کے ساتھ تقابل نہیں کیا جانا چاہیے۔

اب ہم سوال کے اصل مسئلہ کی طرف آتے ہیں، جس کی نشاندہی اُستادِ گرامی شیخ اللہ دتہ صاحب اور چوہدری صاحب دونوں نے کی ہے کہ سورہ النساء کی آیت 34 میں عورت کے لئے نُشُوْزَ کی سزا مختلف ہے اور آیت 128 میں خاوند کے اسی جرم کی سزا کچھ اور ہے۔

اِس کی نشاندہی کرتے ہوئے چودہری صاحب ہمارے اِس موقف کو جُھٹلا رہے ہیں کہ قانون اور خصوصی طور پر قرآنی قوانین بِلا امتیاز ہوتے ہیں جس میں میاں بیوی کے ایک ہی قِسم کے نُشُوْزَ کے وقوع پذیر ہونے پر غیر امتیازی سزائیں نہیں ملتی ہیں۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ زیادہ گہرائی میں جاتے تو وہ جان لیتے کہ آیت 34 میں نُشُوْز میاں بیوی کا نجی معاملہ نہیں بلکہ مُطلق طور پر سبھی عورتوں پر اطلاقی پوزیشن رکھتا ہے اور اللہ کے مقرر کردہ فرائضِ منصبی سے نشوز کی صورت میں سزا کا حقدار ہے۔

اِس کے برعکس دوسری درج آیت کا تعلق اضافی اور مخصوص طور پر میاں بیوی کا نجی معاملہ ہے، لہٰذا اجتماعی نہ ہونے کی وجہ سے سزا کا حقدار نہیں گردانا جا سکتا، بلکہ ایسی صورت میں معاشرہ سے کہا گیا ہے کہ وہ اُن کے درمیان صُلح کرانے کی ہر ممکن کاوشیں کریں اور ناکام ہونے کی صورت میں علیحدگی کا اعلان کر دیں۔ لہٰذا یہاں مناسب ہوگا کہ بیان کی گئی دونوں آیات کا تجزیہ کر کے بات کی مزید وضاحت کی جائے۔

پہلی آیت سورہ النساء کی 34، جس کا حوالہ دیا گیا ہے، اُس کی تفصیل میں ہے کہ

34۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ

مرد اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے، عورتوں کو سامان رزق مہیّا کرنے کے ذمّہ دار ہیں۔ خدا نے مرد اور عورت کو بعض امور میں ایک دوسرے پر فضیلت عطا فرمائی ہے، (مردوں کی فضیلت یہ ہے کہ عورت جسمانی بناوٹ اور مختلف جسمانی فریضوں کے اعتبار سے مسلسل کام نہیں کر سکتی، اس لئے مردوں کی ذمّہ داری ہے کہ وہ اکتساب رزق کریں)، اور یوں مردوں کے اکتساب رزق سے عورتوں کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ پس اس طرح ان (عورتوں) کی صلاحیّتیں نشوونما پاتی ہیں، اور وہ اپنی صلاحیّتوں کو اسی مقصد کے حصول میں صرف کریں گی، جس کے لئے وہ مخصوص صلاحیّتیں دی گئی ہیں۔ (اس طرح جب عورتوں کو سامان رزق کے اکتساب سے فرصت مل گئی) تو وہ اس چیز کی حفاظت کر سکیں گی (جنین کی) جو پوشیدہ طور پر ان کے سپرد کی گئی ہے، اور اگر (بیوی نہیں) عورتوں کی طرف سے تقسیم کار سے سرکشی کا اندیشہ لاحق ہو جائے، تو (1) معاشرہ انہیں سمجھائے، (2) باز نہ آئیں تو ان کے شوہروں یا سرپرستوں سے معاشرہ کہے کہ ان کو خواب گاہوں میں محصور کر دو، اس کے باوجود سرکشی نہ چھوڑیں تو (3) معاشرے کی عدالت انہیں بدنی سزا دے۔

وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ کا مفہوم:

یہاں میاں بیوی کی بات نہیں ہو رہی ہے۔ بات الرجال اور النسآء (4:34) کی ہو رہی ہے اور معاشرے سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تمہیں کسی ایک عورت کی طرف سے یا عورتوں کی طرف سے اندیشہ ہو کہ وہ اپنے فرائض منصبی کے ساتھ بچوں کی نگہداشت نہیں کر رہی ہیں، جس کی وجہ سے یا ان کے منفی رویے کی وجہ سے گھر یا معاشرہ کا ماحول صحت مند نہیں رہا تو فَعِظُوْهُنَّ (4:34) قرآنی معاشرے کی حکومت انہیں سمجھائے گی، نصیحت کرے گی کہ باز آ جاؤ۔ یہ خاوند کو نہیں معاشرے کو یعنی حکومت کو حکم دیا جا رہا ہے۔

وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ (4:34) کا مفہوم:

اگر کچھ عورتیں یا (کوئی عورت) باز نہیں آ رہی ہیں حکومت خاوندوں سے کہے کہ وہ انہیں اپنی خوابگاہوں سے الگ کر دیں اور ان سے عارضی طور پر جنسی تعلق ختم کر لیں۔ یہ کچھ محبوس کر دینے والی بات ہے، جس کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے کہ اگر

تمہیں خطرہ ہو کہ کوئی بے حیائی کی بات ہو جائے گی، تو انہیں ان کے گھروں میں روک لو۔

وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ کا مفہوم:

اگر عورت خوابگاہ الگ کرنے سے بھی اپنی ان حرکتوں سے باز نہ آئے تو پھر عدالت یا حکومت عورت کو بدنی سزا دے گی، تاکہ یہ پھر سے فرائض کی ادائیگی اور گھروں کے ماحول کو خوشگوار بنانے پر راضی ہو جائیں۔ آگے ہے فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ (4:34) ''جب وہ قانون کی اطاعت کرنے پر رضامند ہو جائیں، تو ان پر خواہ مخواہ ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ یہاں خاوند کا تو کہیں ذکر ہی نہیں آ رہا ہے۔ اس سے آگے ہے اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ۝ (4:34) ''یاد رکھو! خدا کے قوانین غالب ہیں، بالادست ہیں''، کوئی سرکش یہ نہ سمجھ لے کہ انہیں کوئی قابو نہیں کر سکتا۔

ہماری بصیرت کے مطابق، اس آیت کے مفہوم کے اعتبار سے یہ شکل ہے۔ معانی کے لئے جس کا جی چاہے لغتِ ''لسانِ عربی'' کی کتاب اٹھا کر دیکھ لے۔ ہم نے لغت ''لسان عربی'' اور قرآن کے انداز تصریف آیات کو ترجیح دی ہے اور ساتھ ہی اس کا بھی خیال رکھا ہے کہ جو مفہوم لیا جائے، وہ قرآن کی مجموعی تعلیم اور دیگر آیات کے مطابق ہو۔ قرآن تو اپنے منجانب اللہ ہونے کا ثبوت ہی یہ دیتا ہے کہ اس کی تعلیم میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ قرآن ایک مقام پہ تو ایک مساوات کی ذہنیت پیدا کرے، اور دوسرے مقام پہ اس کے خلاف کچھ کہے، قرآن ایسا کبھی نہیں کرے گا۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ میاں بیوی کا رشتہ باہمی پسندیدگی کا ہے۔ اگر دونوں طرف سے کسی ایک میں بھی کسی قسم کی کراہت آ گئی تو فریق مقابل دوسرے کے لیے حرام ہو جائے گا (4:19)۔ ازدواج کا باہمی رشتہ رفاقت کا ہے، مودت وسکینت اور رحمت کا ہے، اس لئے قرآن کہتا ہے کہ دونوں کے حقوق مساوی ہیں تو وہ شوہر کو مار پیٹ کا اختیار کیسے دے سکتا ہے؟ اس آیت میں میاں بیوی کا تو ذکر ہی نہیں ہے، ذکر ہے تو الرجال اور النسآء کا ہے۔ میاں بیوی کا ذکر اگلی سورہ النساء کی ایک آیت میں آ رہا ہے، جس کا حوالہ چوہدری صاحب نے اپنے خط میں دے کر امتیازی سزا کی نشاندہی کی ہے۔

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ؕ (4:128)

اور اگر کوئی عورت اپنے خاوند کی طرف سے سرکشی یا بے رغبتی محسوس کرے، تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ جن شرائط پر چاہیں، آپس میں مصالحت کر لیں۔ مصالحت بہرحال بہتر ہے۔

مرد کی طرف سے سرکشی کا اندیشہ ہو تو اس کا حل:

آیت (4:34) میں کہا تھا کہ اگر تمہیں عورتوں کی طرف سے سرکشی کا اندیشہ ہو، تو اس کو آیت (4:35) کے مطابق حل کر لیا کرو۔ زیر غور آیت میں ہے کہ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا (4:128) ''اگر خاوند کی طرف سے سرکشی کا، بے رغبتی کا اندیشہ ہو'' تو اس کو بھی آیت (4:35) میں دی گئی ہدایات کے مطابق حل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

میاں بیوی کے درمیان مصالحتی کوششوں کی اہمیت:

اُوپر کی آیت 128 میں تو شوہر کے نشوز کی بات ہو رہی تھی، لیکن درجِ ذیل آیت (4:35) میں نشوذ کی جگہ شقاق لاکر دونوں میاں بیوی کے ساتھ ایک جیسا سلوک روا رکھنے کی ہدایت دے کر معاملہ کو واضح کر دیا ہے۔

وَاِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَیۡنِهِمَا فَابۡعَثُوۡا حَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهٖ وَحَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهَا ۚ اِنۡ یُّرِیۡدَاۤ اِصۡلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیۡنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیۡمًا خَبِیۡرًا (4:35)

معاشرے سے کہا جا رہا ہے کہ وَاِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَیۡنِهِمَا (4:35) ''جب بھی تمہیں احساس ہو کہ میاں بیوی میں اختلافات پیدا ہو رہے ہیں'' فَابۡعَثُوۡا حَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهٖ وَحَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهَا ۚ (4:35) ''تم ثالثی کرنے کے لیے ایک نمائندہ، بیوی کے خاندان سے، اور ایک نمائندہ خاوند کے خاندان سے مقرر کرو۔ اگر حکومتی ڈھانچہ نہیں ہے، تو ثالثی مقرر کرنے والا معاشرے کا سردار ہو سکتا ہے، اور اگر حکومت موجود ہے تو عدالت ثالث مقرر کر سکتی ہے، تاکہ یہ غیر جذباتی ماحول میں مصالحت کی کوئی راہ نکالیں حَکَم مصالحتی یا ثالثی نمائندے کو کہتے ہیں۔ آگے آیت ہے کہ اِنۡ یُّرِیۡدَاۤ اِصۡلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیۡنَهُمَا ؕ (4:35) ''اگر وہ (میاں بیوی) اور ثالث مصالحت کے ارادے سے کوشش کریں گے، تو خدا ایسی توفیق دے دے گا کہ کسی طرح تباہ ہو جائے'' یعنی خدا چاہتا ہے کہ مصالحت کی صورت پیدا ہو جائے۔ مخالفت میں میاں بیوی کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں، ان کو ٹھنڈا کرنے کے لئے خدا نے مصالحت کرانے کا طریقہ بتایا ہے۔ اگر تین ماہ کی مصالحتی کوششیں بے کار چلی جائیں، تو پھر عدالت طلاق کی توثیق کر دیتی ہے کہ یہ اب میاں بیوی نہیں رہے۔

ازدواجی زندگی کا ترجمہ ہی ''رفاقت کی زندگی'' ہے۔ اگر میاں بیوی میں رفاقت و مودّت کے تعلقات پیدا نہ ہوں، تو اس سے بڑا عذاب اور کیا ہو سکتا ہے۔

درجِ بالا قرآنی آیات کی روشنی میں ہمیں نظر آ رہا ہے کہ:

1۔ جہاں الرجل اور النساء کا ذکر میاں بیوی کے طور پر نشوز کا آپس میں معاملہ ہے تو وہاں دونوں کے درمیان سورہ النساء کی قرآنی آیات نمبر 128 اور 35 کی روشنی میں صُلح کے اقدام لینے اور ناکامی کی صورت میں طلاق کا اعلان کرنے پر ختم ہو جاتا ہے۔

2۔ جہاں الرجل اور النساء کا ذکر بغیر کسی رشتہ کے بطور مُطلق مرد و زن ہو رہا ہے، تو وہاں اپنے فرائضِ منصبی سے نشوز کے وقوع پذیر ہونے کی صورت میں دونوں مرد و زن کے لئے سورہ النساء کی قرآنی آیات نمبر 16 اور 34 کی روشنی میں بدنی سزا کا قانون نافذ کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔

لہٰذا یہ کہنا بجا ہو گا کہ نشوز کے وقوع پذیر ہونے پر مرد و عورت کو اُن کی حیثیت کے مطابق غیر امتیازی طور پر یکساں سلوک کی قرآن میں تجویز کی گئی ہے، لہٰذا اِس مسئلہ میں دونوں مرد و زن کی حیثیت یکساں ہے۔

Manzil ba Manzil **(منزل بہ منزل)**

Chapter 3: Spring's Message (*Payam-e Fasl-e Bahar* پیام فصل بہار) –

Message to Fellow-Ambassadors

Episode No. 2

(Tulu-e-Islam Convention, November, 1959)

By G. A. Parwez (Translated by: M. Alam)

Unchangeable principles

At this point you must be wondering what these unchangeable principles are that form the basis of Islamic state and its constitution. It will take long time to explain the details of the permanent values. So, at this time, I will try to introduce to you some of these values so that you can see what their features are.

One concept of human life is that human beings are defined essentially by physical body which comes into existence according to physical laws. Its machinery remains alive according to physical laws and when this machinery stops working then its cells disintegrate. This is called death which ends human life. This concept of human life is called the materialistic concept of life.

Human self or personality

The other concept of human life is that it not only consists of human body but it has something else which is called "human self" or "human personality"; and which is not the product of any physical evolutionary process nor is it subject to any physical laws. This is granted to everyone by God; but it is given in undeveloped or potential form with the possibility that it can be developed and its potential could be realized. If it is developed and realized, then it does not die with the death of the physical body; but continues to live and marches forward on its onward evolutionary journey.

Just as there are laws for the development of the human body, there are laws for the development for the human self as well. These are the laws which are called by the Quran as unchangeable values or permanent values. If human leads his life according to these values then his self continues to develop. If he deviates from these values then his self becomes weak and disintegrates. However, humans cannot lead life at the individual level according to these values. These permanent values require that life be lived collectively under them which are constitutionally implemented and protected by law at the societal level in the Islamic state as a whole. Thus the Islamic state is nothing but the reflection of these values. The sole reason the Islamic state comes into existence is for the goal of facilitating the development of the human body *and* human *self*. Thus the Islamic state is *not* the end, but it is only a means to achieve this goal.

Therefore, the very first permanent value is human *self*. This value is the center around which all other values revolve. *This* is the foundation on which the structure of دین (*Deen*) is built. If someone believes in God who created this gigantic Universe and its laws according to which it is running so beautifully and smoothly, but does not believe in human self then his belief in God is meaningless. Belief in one's own self is a prerequisite condition for one to believe in God.

Human self has its own individual existence whose result is that every individual becomes accountable for his own actions – good or bad: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (6:164) – Allah's law of requital is that no one else shall be responsible for what he does except his own self and no one shall be made to bear another's burden. And further: وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (2:48) – when the Quranic Order is established no one shall avail another in anything, nor shall any intercession of one for another be considered, nor shall any form of compensation be accepted neither shall they be succored. This is the principle according to which accountability for retribution or award occurs in Islamic state. Since human self is granted to every human equally, every child has equal respect by virtue of being a human child. وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىْٓ اٰدَمَ (17:70) – We have honored humankind. Honor and equal dignity for all human beings is an eternal principle that the whole world cannot change it. A child born in a palace and a child born in a slum have both equal dignity and honor by birth. In it, there is no difference between rich and poor; white or black; believer or unbeliever; nation or race; language or region; social or cultural characteristics.

Humanity means respect for human. This is the fundamental eternal principle of the Quran. A constitution or law that protects this enteral principle will be called Islamic. If it deviates from this principle then it will be called non-Islamic.

Appointment to positions

After granting universal equal dignity to humans by birth, the Quran next addresses the basic principle in running the affairs of a good society. The Quran's decision regarding this is that: وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (6:133) – Allah's law is that everyone is assigned a position according to his deeds. No other consideration – wealth, status, race, family, influence of any kind etc. – should be given in this process. Moving this principle further we reach the level which the Quran describes as: اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (49:13) – According to the Divine Law the criteria to determine status or superiority is how closely and

consciously one follows and guards the Divine Laws? And who obeys Him more? The one whose whole life is in conformity with this criterion is most worthy of respect. The person may either be man or woman, or from any family or tribe. The criterion for superiority is not race or status, but personal character and behavior.

Slavery

The necessary consequence of human honor and dignity is that no human being should be slave to another human in any form. Thus slavery, according to the Quran, is the worst crime of humanity. Leave aside humanity, it is not allowed for a human being to force others to follow his private orders. مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:79) – The fundamental principle of دین (*Deen*) is that no human being – even though Allah may have given him a Code of Laws or the power to enforce it or even given the position of the Prophet – has the right to say to the others: "You should obey me rather than Allah." Therefore, in Islamic state, the obedience will be to the laws only; and these laws are the ones whose structure is erected on the basis of Quran's permanent values. And these laws will apply to everyone equally. No exception whatsoever will be made to anyone no matter how great their position. The Quran declares the Prophet (PBUH) as the first one to submit to these laws: وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (6:163) – I been commanded and I am the first to submit to the commandment.

Justice

Equal application of law is called justice. What great emphasis the Quran puts on justice could be seen from this verse: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (5:8) – O people who believe, always stand up for justice in the cause of Allah. Let not the enmities of others towards you make you deviate from the path of justice. Always, and in all circumstances, act justly. This is akin to being righteous. Always adhere to the Laws of Allah Who is aware of all that you do.

احسان (*I'hsan*) or Mercy

Justice means giving one's due. But the Quran goes beyond this. It mentions احسان (*I'hsan*) along with justice: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (16:90) – Allah has ordered you to do justice with احسان (*I'hsan*) which is usually translated as mercy. But the root meaning of احسان (*I'hsan*) is: to restore balance and proportion. This is also the meaning of beauty – to have proper balance and proportion. If a thing's proper proportion is lost due to any reason then it no longer remains beautiful. The Quran commands that if someone's balance has

longer remains beautiful. The Quran commands that if someone's balance has been lost somehow, then restore his balance; and this way his beauty (as well as the beauty of the society) will be restored. Thus احسان (*I'hsan*) is also a permanent value of the Quran on which its universal system of sustenance rises for improving overall human condition. It is the duty of the Islamic state that it fulfill the basic needs of all; and facilitate the development of everyone's' latent potential equally. In other words, it will be the responsibility of the Islamic state and not that of the parents to make sure that every child's physical, mental, and emotional development takes place optimally without any discrimination.

Universal system of sustenance

Form this it is clear that if anyone sleeps hungry or if any child is left behind in a state then that state cannot be called Islamic. Caliph Umar (R) went so far as to say that even if a dog dies on the banks of Tigris due to hunger then he would be accountable for its death. The Islamic state will establish this universal systems of sustenance within its own dominion first, and then, it will expand it further and further until the entire earth will start shining from the universal light of its creator: وَاَشۡرَقَتِ الۡاَرۡضُ بِنُوۡرِ رَبِّهَا (39:69) – At that time the Earth (i.e., the human society) will glow with the effulgence of Allah's Law of Sustenance and every matter would be decided according to the Divine Code. And a state that will do this will tell its people: اِنَّمَا نُطۡعِمُكُمۡ لِوَجۡهِ اللّٰهِ لَا نُرِيۡدُ مِنۡكُمۡ جَزَآءً وَّلَا شُكُوۡرًا (76:9) – And say to the people for whom they do all this, "We do not do all this as a favor to you. No, not at all! We do not expect anything in return; not even a word of appreciation. In fact, we are doing our duty; and our interest lies only in this. Accordingly, not only are our own "selves" nourished and developed, but that the Divine attributes grow in our personalities as well. This is the objective of human life." This is our life's duty that we have fulfilled. So, therefore, there is no question in this of any personal reward or appreciation:

The taste of patient suffering to improve human condition is itself the reward;
It is an insult to the lover of duty if it expects overt appreciation and reward!

Universal humanity

The intention to nourish others outside the Islamic state should not be for political exploitation or expediency or for making opportunistic alliances to strengthen its power; but it should be purely for the sake of belief that all human beings are members of one human family: كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (2:213) –

Humankind is one single family. This is Quran's eternal and unchangeable principle. It is human greed and shortsightedness that that has divided this single human family into nations and races; and thus has fractured the humankind into umpteen pieces.

Standard for nationhood

According to the Quran there is only one standard for dividing humanity: those who believe in the permanent values of the Quran and make their attainment in real life as their life's mission. They are members of one party or Ummah, no matter what race they belong to and no matter where geographically they live on the planet. Those who reject this ideology are members of other party even if they live within the same country or state. In other words, according to the Quran, there is only one standard for nationhood based on commonality of ideology and not on commonality of country or of race. But it does not mean that one who is not a member of the Muslim Ummah is deprived of the public welfare of the Islamic state's universal system of sustenance. Never. Whatever human rights and benefits the Quran has given to humans by virtue of being humans – all humans are entitled to them and, therefore, one can demand them as of one's human right. This is the reason the Quran has said: وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (70:24-25) – Thus by showing their generosity, they are in fact admitting the reality that their wealth is not only for their own use, but also for those whose resources cannot meet their needs; or those who became incapacitated and are unable to earn, thus being deprived of the necessities of life. This is their established right, which is well-known to everyone. Therefore the generous ones are only returning to them their right; and are not retaining anything which is beyond their needs. It is this eternal principle of transcending beyond race and country into one universal family of humankind about which the Quran proclaims in clear words: مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (13:17) – that which is of benefit to humankind abides on earth. In the words of Iqbal:

Selfish intellect is unmindful of welfare of others;
It only sees its own benefits, not that of others!

The revelation has its eye set on universal benefit;
It sees the welfare of all and everyone's benefit!

***

The philosophy of unity of humankind

At this place, my dear friends, there is a great point of Quran's wisdom that I do not want to move ahead without discussing it. The central focus of Quran's teaching is the unity of creator and the unity of the created. The society that the Quran wants to establish is based on the principle of the unity of humankind. For this purpose the Quran advocates that individuals lead a life by being a symbiotic part of the body of

the society. It does not allow classes within the society on any basis whatsoever. It declares the entire society (which is classless Ummah) as one unit. Then it instructs the Ummah that it should isolate itself from the rest of the world; but it should include others in its cultural and societal advancement.

There is no doubt that one of the purposes related the goal of unity of humankind is that world tensions resulting from political battles and economic confrontation should end. But there is a higher purpose beyond this. There is a peculiar principle of human evolution: that a nation which has reached advanced civilization and culture than other nations and it keeps its achievements only limited to itself, then its progress stops after reaching a certain point. But if it shares with and spreads its achievement and knowledge to other nations then its evolutionary advancement becomes limitless. In other words, according to Robert Briffault's anology, if cultural progress remains limited to an island surrounded by uncultured and uncivilized ocean, then its progress stops after reaching a certain point, and starts stagnating. In the same way if evolutionary progress is limited to only a group within a nation while the rest of its people are at the bottom of the evolutionary chain, then that group's progress stops after reaching a certain point and then starts stagnating. The higher evolution will only occur if the entire nation participates equally in it. According to the same principle, if an individual in a group reaches a higher level of knowledge and intellectual achievement, but does not use his position to help others in evolving to higher level, then his own evolution stops after reaching a certain point. This is the reason the Quran makes the individual part of the collective group, and the group part of the humankind. It does not let them remain separate.

Collective heaven

One cannot enter the Quranic heaven by leading individual life. The Quran tells: فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۝ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ۝ (89:29-30) – You cannot enter this heaven individually, but only through collective living. For this it is important that you should join the group of believers (*Momineen*) who are obedient to Allah. And in this way you shall enter the blissful society of heaven, which has been established according to the Divine Laws. In that heaven it isn't the case that some part of it is heaven and the rest is hell. The Quran wants to create the same type of heaven in the world. Mysticism is wrong from the Quranic point of view because it advocates monastic life in which every individual is concerned with one's own spiritual progress and does not include the whole society in it. In the same way in the world of politics, the Quran rejects a political system in which one group dominates power and influence while the rest live below under them. Proceeding further, at the global and international level, the Quran declares a system against humanity in which one country advances so much ahead that it dominates the rest of the countries in the world. It declares that only that system is worthy of human respect in which all individuals are equal participants. If that is not the case then the progress of even the most developed country will stop and it will slowly lose its preeminence, and eventually will vanish into the dustbin of history.

To Be Continued...

محسوس سجدہ اس کے اس پرخلوص جذبہ کا بیساختہ مظہر نہیں اور محض (Form) ہی (Form) ہے' تو اس سجدے کے کوئی معنی نہیں۔ درحقیقت رکوع وسجود وعبادت کی روح انسان کے جذبہ فرماں پذیری اور اطاعت کے محسوس مظہر ہیں۔ اگر انسان خدا کی اطاعت تو نہ کرے اور صرف اس محسوس شکل کو مقصود بالذات سمجھ لے' تو نہ صرف خدا کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں بلکہ قرآن کریم کے الفاظ میں انسان کے لئے تباہی کا موجب ہے۔ قرآن کریم میں ان محسوس ارکان (Form) کی تھوڑی سی شکل صلوٰۃ اور حج کی تقاریب میں باقی رکھی گئی ہیں اور وہ بھی انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی عمل ہیں۔ جن میں ضروری ہوتا ہے کہ ان کی محسوس شکل میں یک جہتی اور ہم شکلی ہو۔ یہ اجتماعی شکل نزول قرآن کے وقت میں' نبی اکرم ﷺ اور جماعت مومنین میں رائج تھی اور مساجد میں ادا کی جاتی تھی۔ جس طرح سجدہ سے مراد صرف سر کو زمین پر رکھنا نہیں بلکہ اس سے مفہوم قوانین خداوندی کے سامنے سر جھکا دینا بھی ہے' اسی طرح مسجد سے بھی بالخصوص وہ عمارت نہیں جس میں نماز ادا کی جاتی ہے۔ اس سے مراد وہ مقام ہے جو نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں لیا جاتا تھا جو اس نظام کا مرکز ہو جس کی رو سے قوانین خداوندی کی اطاعت کی یا کرائی جائے۔ اس میں اسلامی مملکت کے مختلف امور سرانجام دیئے جا سکتے ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے ''عبادت'' کے معنی اطاعت کے ہیں اور دنیا کا کوئی کام جو قوانین خداوندی کے مطابق کیا جائے عبادت ہو جاتا ہے۔ اجتماع صلوٰۃ بھی چونکہ قانون خداوندی کی اطاعت ہے اس لئے وہ بھی عبادت ہے۔ ''عبادت'' کے لئے کسی ایسے الگ مکان کی ضرورت نہیں جس میں اور کچھ نہ کیا جا سکے۔

عبادت کا مفہوم سمجھنے کے لئے یہ ملحوظِ نگاہ رکھنا ضروری ہے کہ:

(1) قرآن میں جہاں اللہ کی عبادت کا ذکر ہوگا' اس کے معنی قوانین خداوندی کی برضا ورغبت اطاعت ہوں گے (1:5)۔

(2) قرآن میں جہاں طاغوت اور شیطان کی عبادت کا ذکر ہوگا' اس سے مفہوم یا تو انسانوں کے خود اپنے جذبات یا من دون اللہ' باطل پرست مذہبی پیشواؤں کی اطاعت ہوگی' اِن سے منع کیا گیا ہے (30:13, 19:44)۔

(3) قرآن میں جہاں بتوں یا دیوی دیوتاؤں کی عبادت کا ذکر ہوگا' وہاں مفہوم اِن کی توہم پرستانہ پرستش ہوگا (19:42)۔

(4) قرآن میں عبادُ الرَّحمٰن کے معنی ہیں وہ لوگ جو زندگی کی ہر سانس میں قوانین خداوندی کی اطاعت کریں (51:56)۔

☆☆☆

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL. 70
ISSUE
2

Monthly
TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/

قرآن فہمی کی اہمیت

یوں تو دنیا کی ہر کتاب کی یہ کیفیت ہے کہ جب تک اسے سمجھا نہ جائے اس سے مستفید نہیں ہوا جا سکتا، لیکن جس کتاب کی پوزیشن یہ ہو کہ انسان کو زندگی کے ہر معاملے میں اس سے راہنمائی حاصل کرنی ہے اسے کما حقہ سمجھنے کی اہمیت کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ کتاب زندگی کے مسائل کے لئے عملی اصول (فارمولے) دیتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ عملی اصول (فارمولا) اسی صورت میں صحیح نتیجہ پیدا کر سکتا ہے، جب اس کے ہر جزو، مختلف اجزا کی ترتیب اور اس کے مجموعی طریق عمل کا صحیح صحیح علم ہو اگر ان میں سے کسی ایک عنصر کے سمجھنے میں بھی غلطی ہو جائے تو وہ اصول کبھی صحیح نتائج مرتب نہیں کرے گا اور انسان کی ساری محنت رائیگاں جائے گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو لوگ قرآن کریم کی صداقت پر ایمان رکھتے اور اسے ضابطۂ حیات سمجھتے ہیں، ان کے لئے اس کتاب کا صحیح طور پر سمجھنا کس قدر ضروری ہے۔ ان کی تو زندگی اور زندگی کی کامیابیوں کا دارومدار ہی اس پر ہے۔

(غلام احمد پرویزؒ کی کتاب مفہوم القرآن جلد اوّل سے ایک اقتباس)